

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو، پاکستان ۷۷۲

مشاہدات
کابل و یاغستان

از
سولوی محمد علی قصوری
ایم۔ اے کینٹب



شائع کردہ

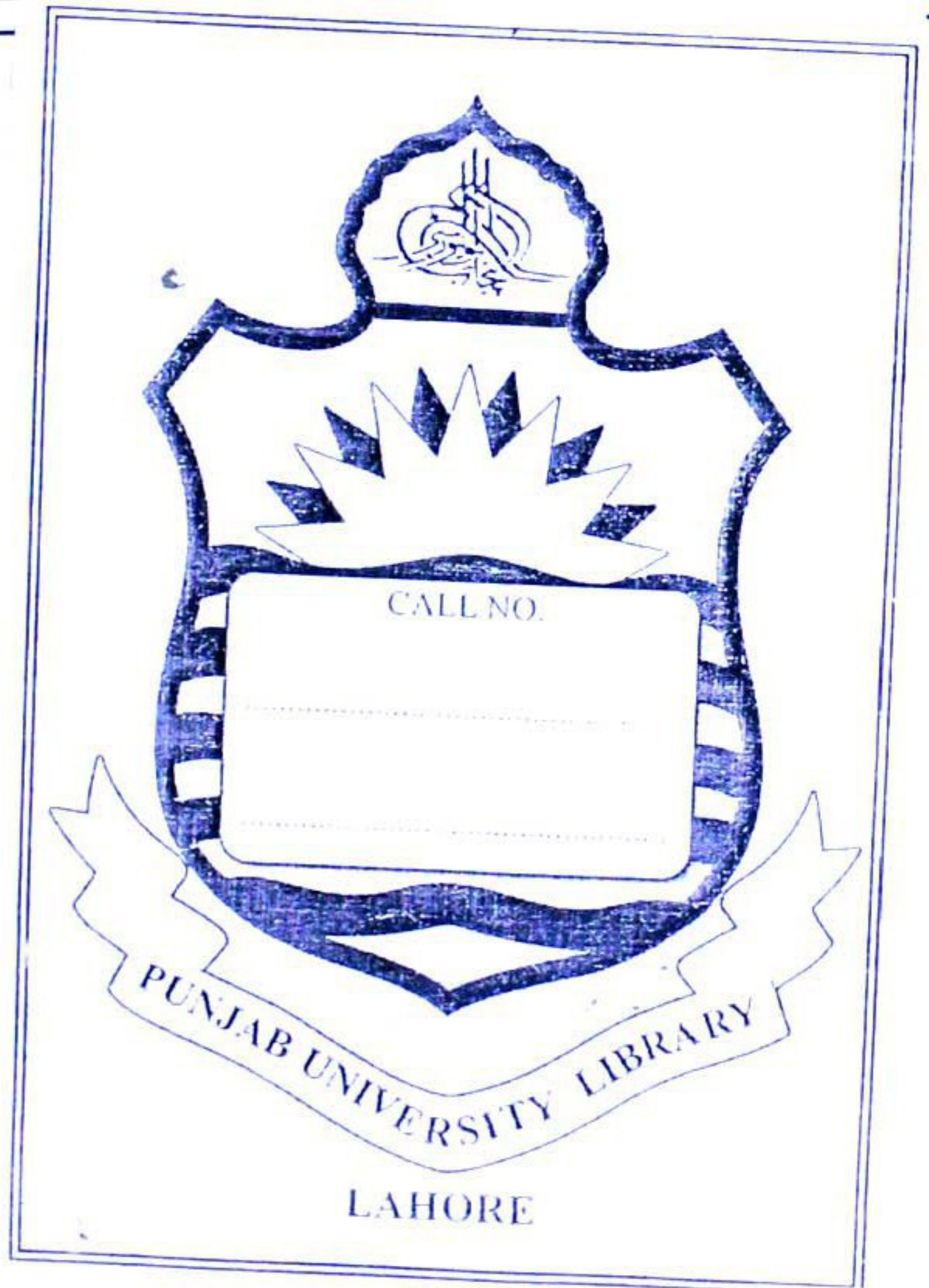
انجمن ترقی اردو (پاکستان)

اردو روڈ۔ کراچی۔

ذخیرہ پروفیسر محمد اقبال مجددی

جو 2014ء میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو

ہدیہ کیا گیا۔



سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان نمبر ۲۷

مشاهدات

کابل و پافغانستان

مصنف

مولوی محمد علی قصوری



شائع کردہ

انجمن ترقی اردو، پاکستان

اردو روڈ، کراچی

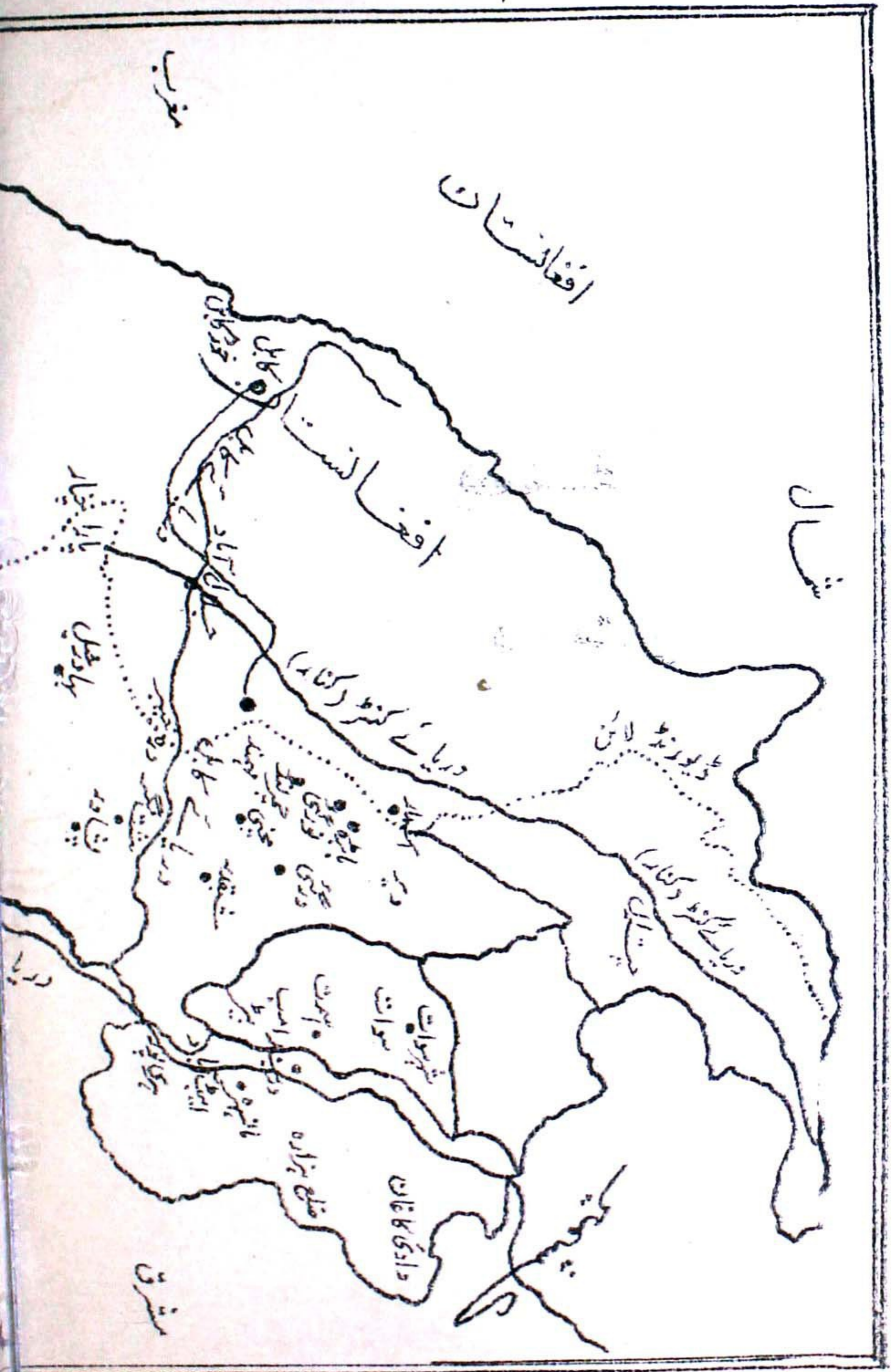
134803

(زیر انتظام حامد علی ندوی)



نقشه

کابل و یاغستان





نقشہ یاغستان

↓
 پیمانہ: ۱ انچ = ۵۰ (پچاس) میل

۱۰
 ۲۰
 ۳۰
 ۴۰
 ۵۰
 ۶۰
 ۷۰
 ۸۰
 ۹۰
 ۱۰۰

میرا سفر کابل سے شروع ہو کر جلال آباد سے بالاسی بالا کنٹر تک ہوا۔ کنٹر
 چمکنڈ کے بالمقابل اور اسمار باہرہ کے بالمقابل افغان سرحد میں واقع ہے۔

پیش لفظ

ہماری درخواست پر مولوی محمد علی قصوری نے جو کومی چالیس برس پہلے کابل و یاغستان تشریف لے گئے تھے اپنے دل چسپ مشاہدات تحریر فرمائے تھے جو رسالہ "تاریخ و سیاسیات" میں بالاقساط شائع کیے گئے تھے۔ اب ان کو کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ حکومت کابل کے موجودہ طرز عمل نے اہل پاکستان کو متحیر اور حیران کر رکھا ہے شاید اس کتاب کے مطالعے سے ان امور پر روشنی پڑ سکے جن سے یہ حیرانی و متحیر جاتا ہے۔

عبدالحمین



فہرست مضامین

- ۱ - تمہید ۹
- ۲ - افغانستان کا تعلیمی نظام ۱۲
- ۳ - افغانستان کا نظام حکومت ۲۰
- ۴ - کابل کے بعد ۳۷
- ۵ - قبائل کی تنظیم ۵۰
- ۶ - انگریزوں کا سفید جھوٹ ۷۹
- ۷ - بیعت کا سوال ۹۶
- ۸ - شاہ اسماعیل شہید کی تحریک اور امیر نعمت اللہ کا طرز عمل ۱۰۳
- ۹ - جماعت مجاہدین اور اسلامی تحریکوں کے اصلی دشمن ۱۱۷
- ۱۰ - بیرونی ممالک سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش ۱۲۶
- ۱۱ - روس کو مشن اور سندھ کٹری کا دورہ ۱۲۹
- ۱۲ - ڈپٹی برکت علی کا تعارف اور سر جارج روس کیپل کی تحریک پر ہندستان کو واپسی - ۱۳۰



تہمید

۱۹۱۰ء کا زمانہ بھی عجیب زمانہ تھا۔ شمالی افریقہ کے تمام ممالک ایک ایک کر کے مغربی استعمار کی نذر ہو چکے تھے۔ طرابلس پر اٹلی نے اچانک حملہ کر دیا۔ برطانیہ نے مصر پر اپنے تسلط کا اعلان کرتے ہوئے ترکی فوجوں کو طرابلس کی مدد کے لئے جانے سے روک دیا۔ ہندوستان کے مسلمان جو اب تک خواب غفلت میں مبتلا تھے کروٹیں سی بدلنے لگے۔ برطانوی ملوکیت پر ان کا اعتماد متزلزل ہونے لگا۔ یہ دن تھے جب میں نے انگلستان کے لئے رخت سفر باندھا۔ میرے دل میں بھی اس زمانے کے نوجوانوں کی طرح ایک ہیجان برپا تھا۔ انگلستان پہنچا تو اچھی طرح آنکھیں کھلیں۔ اور سہلی مرتبہ یہ نشین ہوا کہ برطانیہ کی تمام سیاست اسلام دشمنی کے لئے وقف ہو گئی ہے۔ اور مصر کے بعد ایران، ترکی اور افغانستان کی باری ہے۔ چنانچہ روس نے برطانیہ کے ساتھ خفیہ سازش ایران اور افغانستان کی تقسیم کے لئے کی۔ جس میں برطانیہ نے جنوبی ایران کے تیل کے چشموں کے معاوضوں میں روس کو شمالی ایران پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی۔ روس برطانیہ کی طرح سیاست کے میدان میں بڑی طرح ناکام ہوا اور اس نے اپنی ناکامی چھپانے کے لئے ایران پر فوج کشی کی اور وہ تمام

مظالم جن سے روسی تاریخ کے صفحات خونیں ہیں توڑے گئے۔ مسجدیں بے حرمت کی گئیں بڑھتے اور بچے تلوار کے گھاٹ اتارے گئے اور قرون مظلمہ کا نقشہ دنیا کے سامنے ایک دفعہ پھر آگیا۔

انگلستان کی حکومت نے روس کی اس دہشت پسندی سے بیزاری کا اظہار کیا لیکن درپردہ وہ پوری پوری تائید کرتی رہی۔ نہ صرف یہ بلکہ دوسرے اسلامی ممالک کو تباہ و برباد کرنے کے لئے برطانوی حکومت نے یونان، بلغاریہ اور دوسرے ممالک سے مل کر ترکی کے حصے بخرے کرنے کے لئے ایک پورا منصوبہ تیار کر لیا۔ ۱۹۱۲ء میں یہ سازشیں رنگ لائیں اور جنگ بلقان کے شعلوں نے ترکی حکومت کو چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مسلمانان ہندوستان جنھیں ترکی سے گہری وابستگی تھی۔ اب بیدار ہوئے اور بوجوان طبقے نے برطانوی استعمار کے خلاف آواز اٹھانی شروع کی۔ اتنے میں ہندوستان میں کانپور مسجد کا واقعہ رونما ہوا اور مولانا محمد علی جوہر اور سید ذریحین کا ایک وفد ولایت پہنچا۔ میں اس وقت مسلم اسوسی ایٹی کمیٹی کے صدر تھا۔ میرے دل میں اس وقت کئی جذبات پرورش پارہے تھے۔ برطانوی استعمار سے نفرت کا جذبہ تھا دوسرا مسلمانان عالم کی زبوں حالی کا احساس تھا۔ تیسرا جذبہ اس یقین پر مبنی تھا کہ مسلمانوں کی تباہی کی وجہ ان کی کتاب اور سنت سے بعد اور مجبوری ہے۔ اس عرصہ میں ہندوستان میں مولانا آزاد نے اہلال میں اپنی جذبات کی ترجمانی شروع کی اور اپنی آتش بیانی سے مسلمانوں میں ایک آگ سی لگا دی۔ مجھ پر جوہر کی رفاقت اور ابوالکلام کی خطابت نے بہت گہرا اثر کیا۔ اور میرے دل میں یہ عزم پیدا ہو گیا کہ مجھے برطانوی استعمار سے جنگ کے لئے زندگی وقف کر دینی چاہیے۔ اسی سلسلے میں مختلف منصوبے بناتا اور ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں سے تبادلہ خیالات کرتا رہا۔

۱۹۱۴ء کی جولائی میں ہندوستان واپس ہوا۔ اس کے ایک ہی مہینے بعد پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی اور مجھے اس میں اپنی امیدوں کے پورا ہونے کی جھلک نظر آنے لگی۔ مجھے برطانوی حکومت کی طرف سے کئی ملازمتوں کی پیشکش ہوئی لیکن میرے دماغ میں تو ایک ہی سودا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسلامی ممالک کو مغربی استعمار کے چنگل سے آزاد کرایا جائے۔ میں دہلی پہنچا اور وہاں مولانا آزاد، حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم، مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم اور بعض ممتاز ہندو لیڈروں سے تبادلہ خیالات کا اتفاق ہوا۔ اس عرصہ میں خفیہ اطلاع ملی کہ انگریزوں کی حمایت سے اب افغانستان پر بھی قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے سب لیڈروں کی متفقہ رائے ہوئی کہ میں افغانستان چلا جاؤں اور افغان حکومت کو اس خطرہ سے خبردار کر کے ہندوستان پر حملہ کیلئے تیار کروں۔ چنانچہ ایک ہرمیری تحریک کے بعد اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں نے مجھے جدیدہ کالج کے پرنسپل کے طور پر رکھ لیا اور میں مارچ ۱۹۱۵ء میں کابل کے متعلق میری معلومات بہت سطحی اور زیادہ تر ہندو انگریزی کتابوں اور تریک امیر عبدالرحمن پر مبنی تھیں اپنے ذہن میں افغانستان کو کافی ترقی یافتہ ملک سمجھتا تھا اور شہر کابل کو قسطنطنیہ اور قاہرہ کا ہم پلہ خیال کرتا تھا۔ میں نے افغان دوستوں سے بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس غلط خیالی میں مبتلا رہا۔ یہاں تک کہ کابل پہنچ کر وہ تمام ہوائی قلعے ہبائے منثورا ہو گئے اور معلوم ہوا کہ تریک امیری اور افغان دوستوں کے بیان میں زیادہ تر شاعرانہ مبالغہ سے کام لیا گیا تھا۔ ورنہ افغانستان تعلیمی لحاظ سے نہایت پست اور وہاں کی حکومت بے حد رجعت پسند اور خود غرض قسم کی حکومت تھی۔

جب میں جدیدہ کالج پہنچا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ ایک ادنیٰ اسکول سے بھی بدتر تھا۔ نہ وہاں کوئی نصاب تعلیم تھا نہ جماعتوں کی حد بندی تھی۔ طرفہ تر یہ کہ اسکول میں کوئی مقررہ ذریعہ تعلیم نہ تھا اگر ایک استاد بچوں کو انگریزی میں

کالج کا سائینس ڈیپارٹمنٹ خاص طور پر قابل ذکر ہے کیونکہ جب میں نے اس کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ایک لاکھ سے زائد روپیہ اس پر خرچ ہو چکا ہے لیکن اس کی حالت ایک ادنیٰ اسکول کے دارالترجہ سے بہتر نہ تھی۔ مجھے وہاں جا کر پہلی دفعہ احساس ہوا کہ مسلمان حکومتوں میں مسلمان عہدہ دار بہ استثناء چند کس درجہ خود غرض اور خائن واقع ہوئے ہیں۔ ہم نے ترکی اور ایران کے متعلق پڑھا تھا اور افغانستان میں جا کر بحشم خود

دیکھ لیا۔ مثال کے طور پر ایک معمولی فریکشن مشین **Friction Machine**

(جس سے رگڑ کے ذریعہ بجلی پیدا کی جاتی ہے) کے لئے افغان حکومت کو گیارہ سو روپیہ ادا کرنا پڑا تھا حالانکہ اس کی قیمت اس وقت پندرہ روپیہ سے زیادہ نہ تھی۔ یہی حالت کتب خانہ کی تھی۔ معمولی معمولی ناولوں کی قیمت بیس بیس پچیس پچیس روپیہ لگائی گئی تھی۔ غرض مجھے اس امر کا پختہ یقین ہوتا گیا کہ اسلامی حکومتیں اپنے عمال کی رشوت ستانی کا شکار ہو رہی ہیں ایک اور معمولی سا واقعہ پیش کرتا ہوں میں نے نظارۃ المعارف میں اسکول کی عمارت کی توسیع کی تجویز پیش کی اور دو کمروں کے اضافہ کی منظوری ملی۔ اتفاق سے معین السلطنت صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ ان دو کمروں کی لاگت کیا ہوگی میں نے عرض کیا کہ بمشکل تین ہزار روپیہ۔ خیر وہ تجویز منظور ہو کر محکمہ تعمیر میں گئی۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب انھوں نے تاسی ہزار کا تخمینہ بنا کر بغرض سفارش میرے پاس بھیج دیا۔ میں اسے دیکھ کر حیران ہو گیا جب معاملہ نظارۃ المعارف میں پیش ہوا مجھے اپنے تخمینہ کی سخت پراسرار تھا اور ارکان مجلس کو سرکاری تخمینہ پر۔ آحسب معین السلطنت صاحب نے مجھ کو حکم دیا کہ تم بنو ادو ورنہ تمہارے خلاف انضباطی کارروائی کی جائے گی۔ بھلا ایک پرسپل کو اپنے تعلیمی مشاغل سے اتنی فرصت کہاں مل سکتی ہے کہ اپنی نگرانی میں دو کمرے تعمیر کروائے لیکن کابل میں سب کچھ ممکن تھا چنانچہ میں نے وہ دونوں کمرے بنوائے اور ان کی لاگت صرف تیس سو روپیہ (۲۳۰۰)

روپیہ ہوئی۔ معین السلطنت صاحب کو اس پر اس قدر سخت غصہ آیا کہ انہوں نے چیف انجینئر سے جو انگریز تھا جواب طلبی کی یہ کابل کے منجم انگریزی علی سے میری دشمنی کی ابتدا تھی۔

یہاں بطور جملہ معترضہ میں افغانستان کے انگریز ملازمین کے متعلق کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں اور میں امید کرتا ہوں کہ میرے پاکستانی بھائی ان سطور کو بغور پڑھیں گے۔ کسی اسلامی حکومت کا یہ خیال کرنا کہ اس کا کوئی انگریز ملازم اس کا ملازم ہے۔ فاش غلطی ہے۔ انگریز خواہ وہ پاکستان میں ہو خواہ افغانستان میں خواہ ترکی میں ہو۔ خواہ ایران میں۔ خواہ مصر میں ہو خواہ افریقہ میں کبھی بھی اپنے تئیں کسی غیر حکومت کا ملازم نہیں سمجھے گا بلکہ وہ اپنے تئیں برطانیہ کا ہی ملازم خیال کرے گا اور اس کے تمام اعمال برطانوی حکمت عملی کے مطابق ہوں گے۔ افغانستان میں اس وقت بہت سے انگریز ملازم تھے جن کو علاوہ بیٹھ قرار تمخوا ہوں گے نہایت عالی شان کوٹھیاں، سواری نوکر، چاکر، بجلی پانی سب مفت ملتا تھا مگر ان میں سے ہر ایک اپنے تئیں کنگ جارج کا نمائندہ سمجھتا تھا اور گو افغانستان میں اعلیٰ حضرت امیر صاحب کے علاوہ علیا حضرت ملکہ حضرت عالی نائب السلطنت سردار نصر اللہ خاں حضرت عالی معین السلطنت سردار عنایت اللہ خاں صاحب اور دوسرے امراء و وزراء کے احکام چلتے تھے۔ لیکن ایک انگریز ملازم کے لئے سوائے اعلیٰ حضرت کے اور کسی کا حکم واجباً لا طاعت نہ تھا اور یہ سچ تو یہ ہے کہ دوسرے حکام کو اتنی جرأت نہ تھی کہ کسی انگریز افسر کو کوئی حکم دے سکے۔ ان انگریزوں میں سے ایک افسر تو "مشین خانہ" یعنی اسلحہ سازی کے کارخانہ کا ناظم تھا۔ اس کی تنخواہ غالباً چار ہزار روپیہ ماہوار (انگریزی سکہ) تھی۔ اس کے ماتحت تین چار انگریز بڑے تنخواہوں پر مقرر تھے۔ اسی طرح تعمیرات کا محکمہ بھی ایک انگریز کے تابع تھا۔ اس کو بھی غالباً پونے تین ہزار روپیہ تنخواہ ملتی تھی

کوٹھی سواری وغیرہ اس کے علاوہ۔ اس شخص سے مجھے چونکہ پالا پڑا اس لئے اس کی قابلیت کا اندازہ کرنے کا خوب موقع ملا۔ یہ شخص جیسا کہ اس کا اپنا بیان تھا۔ بمبئی کی کسی یورپین فرم کا "سیلرین" تھا اور انجیری سے اس کی واقفیت صرف اتنی تھی کہ اس کا رخانے کے عمارتی سامان کا انچارج تھا۔ اس نے افغان حکومت کے حکم سے ایک لاسکی اسٹیشن کی تعمیر شروع کی تھی جس پر میرے پہنچنے تک پانچ لاکھ روپہ صرف ہو چکا تھا۔ چونکہ میں نے بھی کیمبرج میں سرجے جے تامپسن کی شاگردی میں لاسکی سے واقفیت حاصل کر لی تھی اس لئے مجھے بڑی حیرت ہوئی جب میں نے سنا کہ پانچ لاکھ روپہ کے صرف کے بعد بھی وہ آلہ بیکار تھا۔ چنانچہ جب دو کمروں کی تعمیر کے تختیہ کے متعلق جھگڑا ہوا جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں تو معین السلطنت صاحب نے مجھے حکم دیا کہ میں لاسکی اسٹیشن کا بھی معائنہ کروں اور اس کے اخراجات کو پڑتالوں۔ پہلے تو انگریز افسر نے مجھے اپنے دفتر میں داخل ہونے یا لاسکی اسٹیشن میں گھسنے کی اجازت ہی نہیں دی لیکن خیر کافی رہو کہ کے بعد وہ رضامند ہو گیا۔ مجھے پڑتال کرنے پر معلوم ہوا کہ لاسکی اسٹیشن ابھی ابتدائی مرحلہ میں تھا اور اس کے آلات نشر و ایصال دونوں کھیل تھے۔ معین السلطنت صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً اس کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ جب اس نے انکار کیا تو انہوں نے سپاہی مقرر کر کے اسے زبردستی سرحد پار کر دیا۔ اس نے ہندوستان پہنچ کر گورنمنٹ آف انڈیا میں افغان گورنمنٹ کے خلاف شکایات کی اور میرے خلاف خوب زہراگلا۔ اب اس کے بعد تمام انگریزی عملہ اور برطانوی گماشتے مجھے اپنا سخت ترین دشمن تصور کرنے لگے۔ اس انگریز کے معاملے نے بہت طول کھینچا اور اعلیٰ حضرت نے معین السلطنت صاحب سے جو اب طلبی کی اور اس انگریز افسر کو چھ ماہ کی تنخواہ اور کرایہ دے کر معاملہ رفع و دفع کیا۔

میں نے یہ سب واقعات ذرا تفصیل سے لکھے ہیں کیونکہ ان کا آئندہ واقعات

سے بہت تعلق ہے انگریز انجینرز کے آنے کے بعد معین السلطنت صاحب نے مجھے اس کی کوٹھی رہنے کے لئے عنایت کی۔ اب کابل میں دو کیمپ بن گئے۔ تمام انگریز میرے دشمن ہو گئے اور انھوں نے میرے قتل کی سازش کی۔ چنانچہ ایک رات ایک انگریز نے جب کہ میں اپنے باغ میں تہل رہا تھا چھپے سے لاٹھی کا ایک ایسا وار کیا کہ میں لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ نوکر آواز سنتے ہی دوڑے اور وہ انگریز بھاگ گیا۔ اب دشمنی ظاہر ہو گئی۔ چند دن بعد جب میری طبیعت ٹھیک ہو گئی تو میں نے اس معاملے کو پورے زور سے معین السلطنت صاحب اور نائب السلطنت کی خدمت میں پیش کیا اور ایک مفصل عریضہ انگریزوں کی اسلام دشمنی پر ملا جملے میں گزارا۔ اس کے بعد میرے قتل کی کئی سازشیں کی گئیں یہ واضح رہے کہ اس زمانہ میں اور شاید اب بھی افغانستان میں کسی شخص کا قتل کروانا ایک معمولی بات تھی بالخصوص انگریزی حکومت کے لئے جس نے افغانستان کے اکثر عمال کو خرید رکھا تھا۔ میں اگر ان تمام سازشوں کا پول کھولوں جس کا مجھے افغانستان میں عینی مشاہدہ ہوا تو شاید لوگ یہ سمجھیں کہ میں انگریز دشمنی میں مبالغہ کر رہا ہوں لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ کسی مسلمان حکومت کے لئے انگریز ملازمین سے صلاح و فلاح کی توقع رکھنا کبریتِ احمر کی تلاش سے کم نہیں ہے۔

آدمیم برسر مطلب۔ اب میں پھر تعلیم کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ تعلیمی اصلاح کا بیڑا تو میں نے اٹھالیا لیکن عملاً ہر میدان میں با یوسیپوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے سرسری سانصاپ تعلیم بنا کر اسکول میں جاری کیا تو معلوم ہوا کہ سوائے ایک یا دو اساتذہ کے کوئی اسناد بھی اس نصاب کو پڑھانہ سکتا تھا بالخصوص انگریزی حساب جغرافیہ سائنس تو ان کی دسترس سے بالکل باہر تھے کیونکہ دو کے سوا باقی تمام اساتذہ ہندوستانی اسکولوں کے میٹرک پاس تھے۔ وہ سب خوشامد کی روٹی کھاتے تھے یعنی کوئی تو معین السلطنت صاحب کے ساتھ جا کر ٹینس کھیلتا تھا کوئی اعلیٰ حضرت کی سیر و تفریح

کے موقعوں پر مٹھائیاں اور کھانے تیار کرتا تھا۔ بعض گانا سنا کر محفل کی رونق بڑھاتے تھے اور اس طرح سے اپنے قیام کو افغانستان میں ناگزیر بنا رہے تھے۔ کئی صاحب اسکول سے کئی کئی گھنٹے غیر حاضر رہتے اور پوچھنے پر یہ جواب دیتے کہ میں فلاں سردار کی حاضری میں تھا۔ اس لئے جب میں نے اوقات اور رخصت کی تعیین شروع کی تو انہوں نے آکر کہا کہ آپ کیوں ایسے ملک کے لئے دردمسریوں لیتے ہیں جہاں گھوڑا گدھا ایک ہی ترازو میں تولے جاتے ہیں۔ آپ کو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ اس کم عمری میں ایسی بیٹ قرار تنخواہ ملے جو افغانستان کے سپہ سالار کی تنخواہ کے برابر ہے اس لئے چند سال میں روپیہ جمع کر کے آرام سے ہندوستان جا کر بیٹھ جانا جب یہ تدبیر نہ چلی تو وہ مجھ سے بگاڑ گئے۔ بالآخر انہوں نے معین السلطنت سے میری شکایت کی اور کہا یہ شخص فارسی بالکل نہیں جانتا اور نہ فارسی میں ریاضی اور سائنس کی تعلیم دے سکتا ہے چنانچہ سردار صاحب ایک دن اچانک (نادر شاہ شہید جو اس وقت سپہ سالار اعظم تھے) کو لیکر اسکول کے معائنہ کے لئے تشریف لے آئے میں اتفاقاً اس وقت دسویں جماعت کو ریاضی کا سبق دے رہا تھا وہ سیدھے میری جماعت میں آگئے۔ میں بدستور پڑھانے میں مشغول رہا وہ بہت توجہ سے سنتے رہے جب درس ختم ہوا تو سپہ سالار صاحب نے ہر سکوت کو توڑا اور عرض کیا کہ حضرت عالی کیا ہیں آپ سے نہیں کہتا تھا کہ مولوی محمد علی کے خلاف سب شکایات حسد پر مبنی ہیں۔ چنانچہ معین السلطنت صاحب نے حکم دیا کہ تمام اسٹاف اور عملہ کو اسکول کے میدان میں جمع کیا جائے ہم ان کے سامنے تقریر کریں گے ان کی تقریر کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

ہم سے بعض ہدباظن لوگوں نے مولوی محمد علی کے خلاف بہت سی شکایات کی تھیں اس لئے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم اور سپہ سالار صاحب اور دوسرے اراکین نظامت مولوی محمد علی کے کام کا جائزہ لیں

چنانچہ ہم مولوی محمد علی کے ندریس کے طریقہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے
ان کی فارسی دانی نے ہم پر خاص اثر کیا۔ اب ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ
تمام استاد مولوی محمد علی مذکور کے طریق تعلیم کی پیروی کریں ورنہ ان کو
فوراً موقوف کر دیا جائیگا۔“

اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ معین السلطنت نے مجھے اعلیٰ حضرت کے حضور میں
پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاہ نادر شہید نے مجھے اپنے گھر پر بلا کر اپنے والد محترم سردار
محمد یوسف خاں اور عم محترم سردار محمد آصف خاں کی خدمت میں پیش کیا اور ان سے
ذکر کیا کہ کس طرح بعض ہندوستانی استاد اور تمام انگریز ملازمین میرے دشمن ہو گئے
ہیں اس پر سردار محمد یوسف خاں مرحوم معذوراً ٹھکھڑے ہوئے اور مجھ سے بغل گیر ہو کر
فرمایا کہ تو میرا بیٹا ہے اور آج سے میرے گھر میں تیرا وہی مرتبہ ہو گا جو نادر خاں ہاشم خاں
اور شاہ محمود خاں کا ہے اور تم اب کابل میں اپنے تئیں تنہا مت سمجھنا بلکہ میں اور
میرا تمام خاندان تمہارے ساتھ ہیں۔ میں یہ ضرور کہوں گا سردار صاحب نے ایک
سچے مسلمان کی طرح اس عہد کو نبھایا اور ان کے تمام صاحبزادوں نے بھی مجھ سے
برادرانہ سلوک کیا چنانچہ شاہ نادر سید سردار ہاشم خاں اور سردار شاہ ولی خاں نے
مبسی میں بھی میرے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرما کر اپنی قدیم برادر نوازی کا ثبوت دیا۔
یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ شاہ شہید کا خاندان اس وقت افغانستان میں ان چند
مشتنئیات میں سے نجا جو دل سے افغانستان اور اسلام کے ہی خواہ تھے۔

اس واقعہ کے تین چار دن بعد اعلیٰ حضرت کا فرمان موصول ہوا کہ میں شرف باریابی
کیلئے کالاف کے میدان میں حاضر ہو جاؤں اور معین السلطنت صاحب مجھے اعلیٰ حضرت
ہمایوں کی خدمت میں پیش کریں گے۔ وقت مقررہ پر سردار صاحب مجھے لیکر کالاف
کے میدان میں پہنچ گئے وہاں بہت سے درباری جمع تھے۔ ان سے میرا رسمی تعارف

کو آیا گیا۔ حقوڑے عرصہ بعد حضرت عالی نائب السلطنت سردار نصر اللہ خاں تشریف
 لائے۔ سردار نصر اللہ خاں اپنی انگریز دشمنی کے باعث مشہور تھے۔ میانہ قد اکبر اہم
 روشن آنکھیں۔ کشادہ پیشانی نہایت نین اور سنجیدہ چہرہ ان کے عزم کا پتہ دیتا تھا۔
 مجھ سے سلام کے بعد ہاتھ ملا کر فوراً ہندوستان کے سیاسی حالات کے متعلق سوالات
 شروع کر دیے۔ ابھی اس گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ خود اعلیٰ حضرت کی رولز ریوٹس
 آموجود ہوئی۔ اعلیٰ حضرت کے ساتھ ان کے دونوں صاحبان خاص یعنی سردار آصف
 خاں و سردار یوسف خاں اور سردار محمد نادر شاہ سپہ سالار اعظم اور سردار ہاشم
 خاں اور سردار شاہ ولی خاں تھے۔ نائب السلطنت صاحب اعلیٰ حضرت کو لیکر گالف
 کے میدان میں داخل ہوئے اور درباریوں سے ٹیک سلیک کرتے ہوئے سیدھے
 میری طرف تشریف لائے اور مجھ سے میری تعلیم کے متعلق سوالات کئے۔ اعلیٰ حضرت
 میانہ قد اور نسبتاً ذہین اندام تھے نہایت عمدہ لندن کا سلاہو اسوٹ اور سیاہ قرافی
 ٹوپی زیب سر تھی۔ مزاج میں تواضع اور انکسار نمایاں تھا۔ مجھ سے اس قدر شفقت سے
 پیش آئے کہ مجھے ذرا بھی اجنبیت محسوس نہ ہوئی اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اسلامی
 اخوت کا رشتہ کس قدر مضبوط ہے کہ شاہ و گدا کو ایک جگہ کھرا کر دیتا ہے۔ اعلیٰ حضرت
 مجھ سے زیادہ نر کیمبرج۔ لندن۔ پیرس اور برلن یونیورسٹی کے متعلق پوچھتے رہے۔ پھر
 ریاضی کے متعلق پوچھا اس کے بعد مجھے گالف کھیلنے کی دعوت دی۔ چنانچہ میں گھنٹہ
 ڈیڑھ گھنٹہ ان کے ساتھ گالف کھیلتا رہا۔ کھیل کے خاتمہ پر اعلیٰ حضرت نے ازراہ الطاف شاہانہ
 فرمایا کہ تم گالف بہت اچھی کھیلتے ہو کبھی کبھی ہمارے ہاں حاضر ہو جایا کرو۔ اس کے
 بعد اعلیٰ حضرت تشریف لے گئے۔

مجھے میرے دوستوں نے مبارک باد دی کہ تمہارے قدم اب کابل میں جم
 گئے۔ لیکن معاندین کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ چنانچہ بعض نے اعلیٰ حضرت سے جا کر

شکایت کی کہ میں لڑکوں کو وہابی بنانا چاہتا ہوں اور اس کی وجہ یہ بتلائی کہ میں نے اسکول میں قرآن شریف کا ترجمہ لازمی قرار دیا ہے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت نے ایک فرمان خصوصی کے ذریعہ سے حکم دے دیا کہ پورا نصاب تعلیم مرتب کر کے بغرض منظوری حضور میں پیش کیا جائے۔

یہاں مناسب ہو گا کہ افغانستان کے نظام حکومت

نظام حکومت پر بھی روشنی ڈالی جائے۔

واضح رہے کہ میں اس نظام کا نقشہ پیش کر دوں گا۔ جسے میں نے اس وقت ہر ایسے دیکھا ممکن ہے کہ موجودہ نظام حکومت میں اصلاح ہو چکی ہو۔ جب میں نے افغانستان کا قصد کیا تو میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ وہاں کا نظام حکومت شخصی یا استبدادی ہے لیکن میرا خیال تھا کہ بہر حال افغانستان ایک باقاعدہ منظم سلطنت ہوگی۔ چنانچہ اپنے افغان دوستوں سے کابل کے نظم و نسق کی داستانیں اور عدل بادشاہی کی حکایتیں سن کر میں یہ خیال کرتا تھا کہ افغان حکومت ایک عادلانہ بادشاہی نظام کا موطن ہوگی۔ لیکن وہاں جا کر ایک عجیب تصویر سامنے آئی۔ افغانستان میں یوں تو امیر صاحب مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت سے حکمراں تھے۔ قانون و قواعد صرف ان کی مرضی تھی۔ بظاہر ایک قاضی القضاة بھی تھے جو شرعی احکام کے نافذ سمجھے جاتے تھے۔ مگر ان کی اصل حیثیت اعلیٰ حضرت کی مرضی کے مطابق شریعت اسلامی کی توجیہ و تنفیذ کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھی اعلیٰ حضرت کے ذاتی مشاغل میں مداخلت تو کیا انھیں عین مطابق شریعت ثابت کرنا قاضی القضاة صاحب کے وظائف میں داخل تھا۔ مثلاً اعلیٰ حضرت کو بدقسمتی سے عورتوں کی طرف کمال استعراق تھا اور ہر روز ان کے لئے لڑکیاں تلاش کی جاتی تھیں اور پین قرار فہمیت پر حاصل کی جاتی تھیں۔ چنانچہ ہمارے اعلیٰ حضرت کے حرم میں شاہرہ نوسو اور ہزار کے درمیان عورتیں تھیں۔ اور بعض لڑکیاں افغانستان

بڑے بڑے خاندانوں کی چشم و چراغ تھیں یا نورستان کی تھیں ان لڑکیوں کو سورتی کہا جاتا تھا۔ اور اعلیٰ حضرت انھیں بیویاں یا کینزوں کے طور پر رکھتے تھے۔ میں نے قاضی القضاة صاحب سے اس لفظ کی وجہ تسمیہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ سورتی وہ کینز ہے جسے اعلیٰ حضرت اپنی ذات کے لئے پسند فرمائیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ عورتیں کیونکر لونڈیاں کہلا سکتی ہیں۔ کہنے لگے کہ نورستان کو اعلیٰ حضرت کی فوجوں نے فتح کیا تھا وہاں کی سب عورتیں لونڈیوں کے حکم میں آگئیں۔ اس لئے اعلیٰ حضرت نے حکم دیا کہ وہاں کی کوئی لڑکی شادی نہیں کر سکتی جب تک کہ اعلیٰ حضرت ان کے ولی کی حیثیت سے اجازت نکاح نہ دیں۔ چنانچہ ہر سال وہاں کی تمام لڑکیاں اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں۔ اب جن پر اعلیٰ حضرت کی نگہ انتخاب پڑ جاتی ہے وہ تو داخل حرم کر لی جاتی ہیں۔ اور باقی ماندہ کو واپس بھیج دیا جاتا ہے اور انھیں نکاح کی اجازت دی جاتی ہے۔ اب رہیں دوسری لڑکیاں تو ان کے ماں باپ ان لڑکیوں کو خود امیر صاحب کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور اعلیٰ حضرت خوش ہو کر انھیں قبول فرماتے ہیں اور باپ کو انعام دیتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو شریعت اسلامیہ کی علانیہ توہین ہے کہنے لگے میاں امیر صاحب کے اعمال پر نکتہ چینی کرنا موت کو دعوت دینا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم بھی خاموش رہو ورنہ توپ پر اڑا دیے جاؤ گے۔

یہ واقعہ میں نے مشتے نمونہ از خروار کے طور پر بیان کیا ہے تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ اس حکومت میں شریعت اسلامیہ کی کیسی گت بنتی تھی اور یوں نام کو وہ عین مطابق شریعت اسلامیہ کہی جاتی تھی۔ قصہ مختصر افغانستان کی حکومت کا صحیح نقشہ کوئی چہار دہم کے الفاظ میں کھینچا جاسکتا تھا۔ اس سے جب فرانس کے وزیر اعظم نے کہا جہاں پناہ یہ حکم خلاف قانون ہے تو اس نے خفا ہو کر جواب دیا کہ "قانون تو میں ہوں" اسی طرح سے افغانستان میں حکومت اور قانون سب امیر صاحب کی ذات میں جمع تھے۔

ان کی زبان سے کسی حکم کا نکلنا قانون تھا۔ پھر شیخ سعدی کی مثال ان پر بالکل صادق آتی تھی کہ:-

”گاہے بہ سلائے برنجندہ و گاہے بہ دشنامے انعام وہند“

اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ افغانستان میں بہ استثنائے چند ہر عہدہ دار اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اعلیٰ حضرت کی خوشنودی مزاج کو زندگی کا مدعا بنائے۔ کوئی ذلیل ترین حرکت ایسی نہ تھی جو اعلیٰ حضرت کو خوش کرنے کے لئے، کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے۔

قصہ مختصر افغانستان میں کسی قانون و آئین کی حکومت نہ تھی نہ عمال حکومت کے اختیارات محدود و مقرر تھے کہ ان سے اپنے فرائض محولہ کے بارے میں سوال کیا جاسکے۔ نہ کوئی بجٹ تھا نہ سالانہ آمد و خرچ کا صحیح اندازہ۔ یوں کہنے کو تو قاضی القضاة نائب قاضی القضاة سپہ سالار اعظم، نائب سالار گورنر، مستوفی الممالک یعنی وزیر خزانہ، خراجچی بھکرک بھی عہدہ دار تھے اور ان کے مشاہرے بھی مقرر تھے لیکن ہر شخص اپنے اپنے حلقہ اقتدار میں صرف امیر صاحب سے خائف تھا۔ ورنہ موقع پاتا تو خود جو چاہے کر گزرتا تھا۔ نائب السلطنت صاحب اور معین السلطنت کے احکام چلتے تھے لیکن امیر صاحب کو ہر وقت ہر محکمہ میں مداخلت کا اختیار تھا۔ دو تین واقعات سے جو میرے سامنے ہوئے اس کی توضیح کرنا چاہتا ہوں۔ میرے گھر کے بالکل قریب مسجد علیا حضرت تھی۔ میں ہمیشہ اس میں فجر اور عشاء کی نماز پڑھنے جایا کرتا تھا۔ ایک دن عصر کے وقت امیر صاحب کی سواری اس مسجد کے سامنے سے گزری۔ دیکھا تو وہ مسجد مقفل تھی۔ واضح رہے کہ تمام مساجد کے آٹھ سرکاری تنخواہ دار ملازم تھے اور ان کا فرض تھا کہ پانچوں وقت کی نماز باجماعت کرائیں اور مسجد کی صفائی اور روشنی کا کما حقہ انتظام رکھیں۔ اعلیٰ حضرت نے پوچھا کہ اس مسجد کے پیش امام اور موذن کون ہیں میرا محلہ کون ہیں اور محتسب کون ہے۔ محتسب ہمارے حبیبیہ کالج کا فارسی کا استاد بھی تھا۔ چاروں حاضر کئے گئے۔ اب

134803

کیا تھا۔ ان کے آتے ہی اعلیٰ حضرت نے ان سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ اپنے چوہدریوں
 کو حکم دیا کہ انہیں دراز کر دو۔ اب انہیں زمین پر لٹا دیا گیا اور کپڑے اتار کر زد و
 کوب شروع کر دی۔ اور اس بری طرح سے پیٹا کہ میرا دل بھر آیا۔ میرے لئے یہ پہلا موقعہ
 تھا جو اس طرح انسانوں کو پیٹتے دیکھا۔ جب وہ خوب پیٹ چکے تو اعلیٰ حضرت نے حکم
 دیا کہ ان سب کو ملازمتوں سے برطرف کیا جاتا ہے اور جتنی تنخواہ یہ اب تک لے چکے
 ہیں وہ سب کی سب ان سے واپس لی جائے اگر یہ نہ دے سکیں تو ان کے گھر ضبط
 کر لئے جائیں۔ دوسرے دن ہمارے نام مدرسہ میں حکم آیا کہ محاسب کو مدرسہ کی ملازمت
 سے موقوف کیا جاتا ہے اور اس کی تمام تنخواہ بحق سرکار ضبط کی جاتی ہے۔ میں اس
 حکم کو پڑھ کر کانپ اٹھا۔ مگر صبر و شکر کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا
 نہ رہی۔ جب وہ محاسب صاحب تیسرے دن خوش خوش تشریف لائے۔ اور بڑے
 فخر سے مجھے معین السلطنت کا پروانہ دکھلایا کہ اعلیٰ حضرت نے اُسے نہ صرف معاف
 کر دیا بلکہ ایک خلعت سے بھی نوازا ہے۔ وہ فی الفور ملازمت پر بحال کر دیے گئے۔
 اسی طرح ایک اور واقعہ رمضان المبارک میں ہوا۔ ایک دن دیکھنے پرانی بیوی تھی۔
 اور اعلیٰ حضرت خود بھی کھانا پکانے میں مشغول تھے۔ کہ اتنے میں مستوفی الممالک حاضر ہوئے۔
 وہ ایک معمر اور متین شخص معلوم ہوتے تھے۔ اس وقت اعلیٰ حضرت کا مزاج حاضر
 نہ تھا۔ ان سے ایک سوال پوچھا۔ انہوں نے جواب تو دیا مگر اعلیٰ حضرت اس پر بگڑ گئے
 فوراً حکم دیا کہ اسے دربار سے نکال دو۔ فوراً چوہدری اس عزیز پر پل پڑے اور اسے
 نہایت ذلت سے زد و کوب کر کے دربار سے باہر لے گئے۔ دوسرے دن جب
 اعلیٰ حضرت کا مزاج حاضر تھا تو حکم دیا کہ مستوفی الممالک کو بلاؤ وہ پھر
 حاضر ہوئے فوراً انہیں خلعت اور انعام سے سرفراز فرمایا اور کہا کہ ہم تم
 سے بہت خوش ہیں۔ وہ شخص اس قدر مسرور ہوا کہ گویا اسے کوئی بہت بڑی دولت

مل گئی ہے اور پہلے دن کی ذلت و رسوائی کا خیال تک نہ تھا۔
یہ تذلیل اور زد و کوب ایسی عام بات تھی کہ افغانستان کا کوئی عہدہ دار اس میں
عارف محسوس نہ کرتا تھا بلکہ ہر شخص فخریہ اس کا ذکر کرتا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا تھا کہ
اعلیٰ حضرت نے مجھے زد و کوب تو کی مگر اس کے بعد انعام سے بھی نوازا۔ ان باتوں
سے عمال میں خودداری کے کامل فقدان کے علاوہ عجب طرح کی خود غرضی اور بے اصول
زندگی پرورش پاتی تھی اور ملک و ملت کی بہی خواہی یا فرض شناسی کا کسی کو خیال تک
نہ آتا تھا۔ معدودے چند مستثنیات کے علاوہ کوئی شخص بھی ایسی پست ذہنیت سے
بالا تر نہ تھا۔ اس کا جو اثر حکومت کے نظم و نسق پر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ رشوت
ستانی کی انتہائی گرم بازاری تھی اور سوائے چند حکام بالا کے سب اس میں دلیر اور
جری تھے۔ میں نے اتنی شدید بددیانتی کسی ملک میں نہیں دیکھی۔ غالباً اس کی ایک وجہ
تو یہ تھی کہ ع

عس بہ خانہ و شاہ در حرم سر اخفت است

کسی شخص کو اپنے کام کی باضابطہ دیکھ بھال اور محاسبے کا اندیشہ نہ تھا۔ دوسرے
ہر شخص ظاہری شان و شوکت کا اسیر تھا۔ آپ معمولی سے معمولی کلرک کے گھر بھی چلے
جائیں تو اس کے ہاں نہایت پرتکلف قالین کے فرش، محل کے گدیے، اطلس کے تکیے،
اور ریشم کے پردے دیکھیں گے۔ لوگر چاکروں کے علاوہ دو ایک کینزریں بھی صاحب
خانہ کے لئے موجود ہوتی تھیں۔ یہ دیکھ کر خیال پیدا ہوتا تھا کہ شاید اس کی تنخواہ ہزار
بارہ سو روپے ہوگی۔ لیکن کسی کلرک کی تنخواہ اس زمانہ میں انگریزی سو روپے سے
زیادہ تھی۔ اور سو روپہ بھی پرانے صدر منشیوں اور دفتر کے منتظم کو ملتے تھے۔ غرض
یہ سب شاہ خرچیاں "بالائی آمد" کی بدولت تھیں۔ افغانستان میں رشوت ستانی کا یہ
حال تھا کہ آپ کوئی کام بغیر رشوت کے کراہی نہ سکتے تھے۔ تنخواہ شمار میں نہ تھی۔ ہر ملازمت

میں پہلے یہ سوچا جاتا تھا کہ رشوت کمانے کے لئے کتنے مواقع ہیں۔ جب صورت حال ایسی ہو تو حکومت کیا خاک ہوگی۔ افغانستان میں فی الحقیقت اس وقت کوئی منظم حکومت نہ تھی۔ دو دو۔ تین تین سال کے بقایا چلے آ رہے تھے۔ بہت سے افراد کو مہینوں تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ اور ان کی گذر لوٹ کھسوٹ پر تھی۔ بدامنی کا یہ حال تھا کہ لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کا کوئی ذمہ دار نہ تھا۔ چوریوں کی بہت کثرت تھی۔ اور جرائم کی بھرمار کسی معاملہ کا اعلیٰ حضرت تک پہنچنا محال نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ اور اگر کوئی معاملہ امیر صاحب تک پہنچ جاتا تھا تو پھر یا تو اس کا فیصلہ اسی وقت ہو جاتا تھا یا پھر ایسا ملتوی ہوتا کہ اس کی پیشی کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ کیونکہ اعلیٰ حضرت کو کسی بھولے ہوئے واقعہ کی یاد دلانا سوتے فتنہ کو بیدار کرنا تھا۔ اور اگر ان کا مزاج برہم ہوا تو یاد دلانے والے کی فوری مرمت ہو جاتی تھی۔

مجھے جب یہ حکم ملا کہ نصابِ تعلیم تیار کر کے حضور میں پیش کیا جائے تو میں نے نہایت محنت سے نصابِ تعلیم مرتب کیا اس میں کابل میں ایک اول درجہ کی یونیورسٹی کے قیام کا خاکہ پیش کیا۔ اس کی بنیادیں نکالیں کروائی گئیں۔ ہر ایک شاید (۸۰) (۸۰) فلسفہ کاغذوں پر تھی۔ وہ پہلے معین السلطنت صاحب کی خدمت میں پیش کی گئی۔ انہوں نے اسے بہت پسند کیا اور اعلیٰ حضرت کے حضور میں خود لے جا کر پیش کیا اعلیٰ حضرت نے نوازشِ خسروانہ سے مجھے شرفِ باریابی بخشا۔ اور کھانے پر مدعو فرمایا۔ کھانے پر تمام شہزادگان مصاحبانِ خاص۔ اور نادر شاہ مرحوم اور ان کے تمام بھائی مدعو تھے۔ کھانے سے پہلے میں نے باقاعدہ سکیم کی ایک نقل حضور میں پیش کی۔ شاہی خوش لوئیں وہیں کھڑا تھا۔ امیر صاحب نے اس کو حکم دیا کہ اس پر حکم لکھ دو کہ قاضی القضاة صاحب مذہبی نقطہ نظر سے معاینہ کیے اسے ہمارے حضور میں پیش کریں کھانے بعد ہم سب رخصت ہو گئے لیکن اس کے بعد میں قریباً آٹھ مہینے کابل میں رہا۔ اس عرصے میں تو اس

تجویر کو دوبارہ اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش ہونے کا موقع ملا نہ تھا۔ گو میرے آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرا نانا اللہ خاں نے اس کو نکالوا کر بہت کچھ اسی کے مطابق افغان کا نظام تعلیم استوار کیا۔ اس تجویز کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ لکھتا ہوں۔ ڈنر کے دوسرے دن۔ قاضی القضاات صاحب نے مجھے یاد فرمایا اور کہا کہ مولوی صاحب یہ آپ نے کیا ستم ڈھایا ہے۔ کہ نصاب تعلیم میں قرآن شریف کا ترجمہ رکھ دیا ہے۔ بچے قرآن شریف جیسی پُر حکمت کتاب کو نہیں سمجھ سکتے اس لئے وہ وہابی ہو جائیں گے۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ جناب قاضی صاحب اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کیا ہے کہ ہم قرآن شریف خود پڑھیں اور دوسروں کو پڑھائیں۔ لیکن آپ لوگ اس پر تاملے لگاتے ہیں۔ اس پر قاضی صاحب سے بہت دیر تک بحث ہوتی رہی۔ جب وہ بالکل لاجواب ہو گئے تو انہوں نے کہا کہ مولوی صاحب میرا یہ فیصلہ ہے کہ جب تک آپ اس نصاب میں سے قرآن شریف کے ترجمہ کو نہ نکالیں گے۔ میں اس کے اجرا کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں نے کہا کہ قاضی صاحب میرا بھی فیصلہ ہے کہ قرآن شریف اس نصاب میں رہے گا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ پیشتر اس کے کہ میں اپنے قلم سے کاٹوں خدا کرے کہ میرے دونوں ہاتھ مثل ہو جائیں اور اگر آپ اسے خارج کرینگے تو میں یقیناً ایک لمحے کے لئے بھی افغانستان کی نوکری نہیں کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ میں قاضی القضاات ہوں اور میرے ایک فتوے سے تم مکمل ہی توپ سے اڑا دیے جاؤ گے۔ میں نے کہا کہ اچھی بات ہے جو کچھ آپ کے اختیار میں ہے آپ کر لیجئے۔ کیونکہ میرا ایمان ہے کہ مومن پر موت دو دفعہ طاری نہیں ہوتی اور میں اٹھ کر چلا آیا۔ دوسرے دن علی الصبح میں نے معین السلطنت صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام معاملہ عرض کر دیا۔ انھیں میری صحت رائے کا اطمینان ہو گیا تو نظارۃ المعارف کا جلد طلب کیا۔ اس میں سپہ سالار صاحب یعنی غازی نادرخاں مرحوم اور قاضی القضاات صاحب دونوں موجود تھے۔ معین السلطنت صاحب نے فرمایا کہ آج ہم صرف مولوی محمد علی کے

مجوزہ نصاب تعلیم پر بحث کریں گے۔ چنانچہ قاضی صاحب نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں اس نصاب تعلیم کے مخالف ہوں۔ اور جب تک قرآن شریف کے ترجمہ کو اس میں سے نہ نکال دیا جائے میں اسے جاری کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا کیونکہ قرآن شریف کا ترجمہ پڑھانے سے بچے بد عقیدہ ہو جائیں گے۔ اب صاحب صدر نے مجھے حکم دیا کہ ان کے اعتراض کا جواب دوں میں نے اس کے جواب میں کوئی آدھ گھنٹہ تک تقریر کی۔ جب میری تقریر ختم ہوئی تو صاحب صدر اور سپہ سالار صاحب نے بہ یک وقت فرمایا۔ مولوی صاحب آپ نے تو کمال کر دیا۔ ایسی مدلل اور پر مغز تقریر ہم نے نہیں سنی اور ہمارے خیال میں اب قاضی صاحب کو آپ کے مجوزہ نصاب تعلیم کی مخالفت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ صاحب صدر کے الفاظ نے جاو کا کام کیا اور قاضی صاحب فوراً کھڑے ہوئے اور کہا کہ اگر حضرت عالی کی مرضی مبارک یہی ہے کہ یہ نصاب تعلیم اسی طرح سے منظور کر لیا جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ صاحب صدر نے فرمایا کہ ہاں میں چاہتا ہوں کہ یہ جلد از جلد نافذ ہو۔ چنانچہ قاضی انقضا صاحب نے حامی بھری کہ میں اس کی تائید کر کے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ مگر اس کا جو حشر ہوا وہ اوپر لکھ چکا ہوں۔

افغانستان جس کے متعلق میں اس قدر امیدیں لیکر گیا تھا۔ سیاسی طور پر بالکل مردہ تھا۔ امیر حبیب اللہ مرحوم جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں نہایت سخت مستبد اور مطلق العنان بادشاہ تھے، اس لئے وہ ہر سیاسی سرگرمی کو مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے۔ اور اس لئے افغانستان میں کسی سیاسی تحریک میں منسلک ہونا موت کو دعوت دینا تھا۔ اس پرستم یہ تھا کہ امیر صاحب کا سارا بجٹ انگریزوں کے روپے کا مرہون احسان تھا۔ ان کا تمام ذاتی خرچ ہندوستان کے امدادی روپے سے چلتا تھا۔ پھر مختلف بین قیمت تحالف بھی سرکار انگریزی سے اعلیٰ حضرت کی خدمت

میں پہنچتے رہتے تھے۔ بڑے بڑے افغان افسر تقریباً تمام انگریزوں کے تنخواہ دار تھے۔ مجھے وہاں پہنچکر اپنی بے بسی کا احساس ہوا اور تمام دوستوں نے بھی تاکید کی کہ یہ بڑی خاردار وادی ہے اس لئے بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔ انگریزی سازشوں کے جال نے افغان حکومت کو عضو معطل بنا رکھا تھا۔ کسی شخص پر اعتماد کرنا بڑی بے وقوفی تھی۔

میں اس عرصہ میں افغانستان کے سیاسی حالات کا جائزہ لیتا رہا اور مختلف اشخاص کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا، تاکہ کسی نہ کسی طرح اپنے اصلی مشن کو سرانجام دوں۔ مجھے معلوم ہوا کہ نائب السلطنت سردار نصر اللہ خاں مرحوم اور ان کی پارٹی سخت انگریز دشمن ہے۔ لیکن وہ بھی اپنے بڑے بھائی کے خوف سے علانیہ ایسے لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتے جو انگریزوں کے مخالف ہوں۔ مشکل یہ تھی کہ میں معین السلطنت صاحب یعنی سردار عنایت اللہ خاں۔ ولعہد حکومت کا ماتحت بنا دیا گیا تھا اور معین السلطنت کے ہر ماتحت کو نائب السلطنت صاحب نہایت مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے۔ اس لئے میرے لئے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ میں علانیہ نائب السلطنت صاحب سے جا کر بلوں اور سیاسی امور پر گفتگو کروں۔ معین السلطنت صاحب کو نہایت ہوشمند نوجوان تھے لیکن اپنے باپ کے خوف سے سیاسی تحریکوں سے بہت دور بھاگتے تھے۔ مجھے آنکھوں نے اجازت دی کہ بے شک تم نائب السلطنت کی خدمت میں جا پا کر و مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ وہ تمہارا اعتبار نہیں کریں گے اس لئے تم کوئی ایسا واسطہ ڈھونڈو جو ان کی بدظنی کو دور کرے۔

مولوی عبدالرحیم مرحوم جن کامیں اوپر ذکر کرایا ہوں۔ جب یاغستان پہنچے تو انہوں نے جاتے ہی جماعت مجاہدین میں کافی رسوخ حاصل کر لیا اور

امیر المجاہدین کے وکیل بن کر کابل آئے اور نائب السلطنت پھر خود امیر حبیب اللہ خاں سے ملاقات کی۔ اس وقت چونکہ جنگ زوروں پر تھی اور انگریزوں کو قدم قدم پر شکست ہو رہی تھی اس لئے اعلیٰ حضرت بھی یہ چاہتے تھے کہ وہ کچھ نام پیدا کر لیں۔

کبھی غلو بت ترسا کے رام کرنے میں

کبھی یہ شوق کہ کچھ کام ہو خدا کے لئے

مولوی عبدالرحیم نے اپنی شخصیت کو انگریزوں سے چھپانے کے لئے اپنا نام بدل لیا تھا اور سفارتی کاغذات میں مولوی محمد بشیر کے نام سے متعارف تھے۔ وہ حیرت انگیز انسان تھے۔ ان کی انتظامی قابلیت اور سیاسی سوجھ بوجھ بے مثال تھی انھوں نے کابل پہنچتے ہی امیر صاحب کے مزاج میں اتنا عمل دخل پیدا کر لیا کہ امیر صاحب نے ان کو یاغستان کی تنظیم کے لئے مامور فرمایا اور بارہ ہزار روپیہ سالانہ تنظیمی اخراجات کے لئے ان کے حوالے کیا۔ مولوی محمد بشیر کو کابل میں میری جستجو ہوئی آخر ایک دن رات کے دس بجے وہ میرے گھر آئے، میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے اس وقت کس قدر خوشی ہوئی۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں بفضلہ اپنے مشن میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر اس وقت یہ طے پایا کہ میں ابھی کچھ دن اور خاموش رہوں۔

ایک چھینے کے بعد مولوی محمد بشیر صاحب واپس لوٹے اور بیت کامیاب لوٹے، انھوں نے یاغستان کے اکثر ملاؤں سے امیر صاحب کے نام بیعت کے خطوط حاصل کر لئے۔ واضح رہے کہ یاغستان اس علاقے کو کہتے ہیں جو تقسیم سے قبل سرکار انگریزی کی سرحد اور افغانستان کی سرحد کے مابین واقع تھا۔ افغان سرحد کا نقشہ ڈیورینڈ کمیشن (Durand Commission) نے کیا تھا اور اس وقت یہ تمام علاقہ انگریزی حلقہ اثر کہلاتا تھا۔ لیکن درحقیقت وہاں کوئی حکومت نہ تھی اسی لئے اس کو یاغستان کہتے تھے جس کے لفظی معنی ہیں ”باغیوں کا ملک“ وہاں صرف ملاؤں کی حکومت تھی۔

مختلف علاقے، مختلف قبائل کے قبضے میں تھے اور ہر قبیلے میں ایک ملا ہوتا تھا وہ ملا نہ صرف ان لوگوں کا مذہبی پیشوا ہوتا تھا بلکہ تمام معاملات میں ان کا حکم ناطق تھا۔ قبائلی زندگی حیرت انگیز طریقے پر پرانی تھی اور ان لوگوں کا اخلاقی معیار نہایت ہی بلند تھا۔ ہر قبیلے کی ایک پچائیت ہوتی تھی، وہ پچائیت ملا صاحب کی سرکردگی میں اپنے اپنے حلقے میں پورا اقتدار رکھتی تھی۔ یہاں تک کہ کسی شخص کو قبیلہ بدر کر دینا، اس کا گھر بار جلا دینا یہ سب کچھ پچائیت کے اختیار میں تھا اور کسی شخص کی مجال نہ تھی کہ پچائیت کے فیصلے کے خلاف جبکہ اس کو ملا صاحب کی منظوری حاصل ہو جائے لب تک ہلا سکے۔ قصہ مختصر کسی ملا کا امیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لینا اس امر کا مترادف تھا کہ اس کا قبیلہ انگریزوں کے بجائے امیر صاحب کے تابع ہے۔ بلکہ انگریزوں کا سخت مخالفت و معاند۔

چنانچہ جب مولوی محمد بشیر صاحب یہ خطوط لیکر آئے تو پہلے نائب السلطنت صاحب نے خود ان کو لے جا کر اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ اعلیٰ حضرت ان خطوط کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے اور مولوی بشیر صاحب کو ملا بشیر کا خطاب مرحمت فرمایا اور تمام یاغستان کے لئے ان کو وکیل مختار مقرر کیا اور ایک زمانہ اسی مضمون کا مرحمت فرمایا کہ ملا بشیر امیر صاحب کی طرف سے بیعت اطاعت لینے کے مجاز ہیں۔ افغانستان میں سیاست شجر ممنوعہ کا حکم رکھتی ہے۔ کسی ملازم مہر کار کی مجال نہ تھی کہ وہ کسی سیاسی کام میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شرکت کرے۔ خود اعلیٰ حضرت پر انگریزی حکومت کا اس قدر خوف طاری تھا کہ وہ علانیہ انگریز کے خلاف کسی سازش میں شرکت کرنے سے ڈرتے تھے۔ ملا بشیر کا یہ کمال تھا کہ وہ اعلیٰ حضرت کو خوف و ہراس کے اس گنبد سے نکال لائے۔

نائب السلطنت صاحب پہلے ہی ہر ایسی تحریک میں جو انگریزوں کے خلاف

ہوتی نہایت سرگرمی سے حصہ لیتے تھے، اس لئے ملا بشیر نے صحیح معنی میں ان سے میرا تعارف کرایا اور میرے منصوبے کے متعلق ان سے ذکر کیا اور آخر یہ قرار پایا کہ محمد علی اپنی تحریر حاجی عبد الرزاق صاحب نائب قاضی القضاة صاحب کو دے دیں، وہ اس کو نائب سلطنت صاحب تک پہنچادیں۔ یہ حاجی عبد الرزاق صاحب بھی عجیب آدمی تھے نہایت فہیم دور اندیش اور مردم شناس تھے۔ انگریزی دشمنی ان کے رگ و ریشے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ افغانستان کے عہدہ دار بہت کم قابل اعتماد تھے، بلکہ زیادہ غدار اور انگریزی ایجنٹ تھے۔ لیکن حاجی صاحب ان نادر ہستیوں میں سے تھے جو سرتا پناہ خالص اور اسلام کے پتے محب تھے۔ ان کی سیاسیات حاضرہ سے واقفیت غیر معمولی تھی۔ ملا بشیر نے ان سے جب میرا ذکر کیا تو وہ خود میرے گھر تشریف لائے۔ اور میں نے اپنی تجویز ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ جس کا مفاد یہ تھا کہ ہندوستان اسلحہ اور فوج سے تقریباً خالی ہو چکا ہے۔ صرف گیارہ ہزار فوج اور ایک ٹوپ خانہ ہندوستان میں ہے۔ اس لئے اعلیٰ حضرت کے لئے اس سے بہتر موقع ہندوستان پر حملہ کرنے کا نہیں ہو سکتا۔ حاجی صاحب سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ تم اس کو قلمبند کر دو میں اعلیٰ حضرت کو ضرور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار کر لوں گا۔ میں نے تجویز قلمبند کر کے حاجی صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔ اس میں یہ بھی صراحت کر دی تھی کہ تاریخ اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ انگریزی سیاست اور انگریزی اقتدار اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ اس برطانوی قبضہ پرستی کی موت تمام اسلامی ممالک کی آزادی کا پیغام لائے گی۔ برطانوی ملوکیت پرکاری ضرب لگانے کا اس سے بہتر موقع پیدا نہیں ہو سکے گا۔ ہندوستان پر حملہ کرنے سے پہلے اعلیٰ حضرت کو کانگریس سے سمجھوتہ کر لینا چاہیے، پھر ہندوستان افغانستان کی اعانت کے لئے اٹھ کھڑا ہوگا اور انگریزی حکومت کا بہت آسانی سے خاتمہ ہو سکے گا۔ حاجی صاحب نے یہ تحریر

نائب السلطنت صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ انہوں نے پہلی دفعہ مجھ کو تخلیہ میں طلب کیا۔ میرے منصوبے پر خوب بحث کی۔ اس کے بعد وہ اس کو اعلیٰ حضرت کی خدمت میں لے گئے۔ اس کے چند روز بعد حاجی عبدالرزاق صاحب نے مجھ کو بلایا اور فرمایا کہ اعلیٰ حضرت ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور اس غرض کے لئے کانگریس سے معاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کام کے لئے مولانا محمد علی یا حکیم اجمل خاں صاحب یا پنڈت موتی لال ہزویا کوئی اور اس پائے کے ہندوستانی لیڈر کو کابل آنا چاہیے۔ اس عرصہ میں برٹش گورنمنٹ بھی غافل نہ تھی اور افغانستان کی رتی رتی بھر کی خبریں انگریزی حکومت کو مل رہی تھیں چنانچہ انہوں نے ایک طرف تو ۱۹۱۶ء میں کانگریس مسلم لیگ کا معاہدہ لکھنؤ کیا۔ اور دوسری طرف مسلمان لیڈروں کی گرفتاری یا نظر بندی کے احکام جاری کئے۔ حکیم صاحب مرحوم کو جب کابل کی دعوت پہنچی تو انہوں نے مولانا عبید اللہ سندھی کو جن کی گرفتاری کی افواہیں گرم تھیں۔ ملا بشیر کے پاس بھجوا دیا۔ اور وہ آزاد علاقے سے کابل پہنچ گئے۔ مجھے اس کی پہلے سے اطلاع ہو چکی تھی اس لئے میں نے مولانا کے لئے زمین ہموار کر دی تھی۔ مولانا میرے ہاں آکر ٹھہرے۔ اور اب میرا گھر کابل میں سیاسی گفتگو کا مرکز بن گیا۔ لاہور کے چند طلبا جو ہجرت کر کے آئے انگریزوں کے اشارے سے کابل میں گرفتار کر لئے گئے تھے، مولانا سندھی کے کابل آنے پر امیر صاحب نے ان لڑکوں کو بھی رہا فرمادیا۔

یہی زمانہ تھا جب کہ جرمنی سے طہران کے راستے ایک مشن آ پہنچا۔ اس مشن

کے رئیس راجہ ہندو پرہتاب تھے اور **Von Henning** فون ہینٹنگ قیصر ولیم کے وکیل مختار۔ ناظم بے سلطان روم کے وکیل مختار اور مولانا بركات اللہ غدر پارٹی کے نمائندے اور دوسرے اراکین تھے۔ اس مشن کے آتے ہی کابل میں ہل چل مچ گئی۔ کیونکہ ان کی آمد ایسی نہ تھی کہ خفیہ رکھی جاسکتی۔ امیر صاحب کو اپنے ملازمین میں

سے کوئی ایسا معتمد علیہ نہ ملا۔ جو انگریزی۔ فرانسیسی۔ اور فارسی پر عبور رکھتا ہو۔ اس لئے جرمن مشن کے مراسلات وغیرہ کا فارسی میں ترجمہ کرنا اور ان کو نائب السلطنت صاحب کی وساطت سے اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش کرنا مجھے تفویض ہوا۔ مشن نے اس بات پر زور دیا کہ افغانستان فوراً انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ ہندوستان کی ایک عارضی حکومت افغانستان میں قائم کی جائے جو افغانستان کے ساتھ باقاعدہ معاہدہ کرے اور اسے ہندوستان پر حملے کی دعوت دے۔

ہندوستان کی یہ **Provisional** عارضی حکومت بنائی گئی۔ اس کے صدر راجہ ہند پر تاب۔ نائب صدر مولانا عبداللہ سندھی۔ وزیر اعظم مولانا بکرت اللہ۔ اور وزیر خارجہ راقم الحروف بنائے گئے۔ ملا بشیر کو وزیر دفاع اور یاغستان کی لشکر کشی کا ذمہ دار بنایا گیا۔ ایک پوری اسکیم حملے کی تیار کی گئی۔

ہندوستان پر حملے کے لئے ضروری تھا کہ امیر صاحب کے اسلحہ خانے کا جائزہ لیا جائے۔ اور فوجی تیاری شروع کر دی جائے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت نے کمال جرات سے کام لیتے ہوئے تمام انگریز ملازموں کو برطرف کر دیا۔ اور کپٹن نیڈر ماسٹر کو تمام کام تفویض کر دیا جو بہت ہوشیار اور اپنے فن کا ماہر تھا۔ اس نے جب توپ خانہ کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ انگریز ملازمین نے تمام توپوں کو بیکار کر دیا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ان کی درستی کا کام شروع ہوا۔

انگریزوں کے اخراج نے امیر صاحب کے تمام عزائم کو بے نقاب کر دیا۔ اور انگریزی حکومت کو اس وقت یقین ہو گیا کہ امیر صاحب اب ہندوستان پر حملہ کرنے والے ہیں۔ انگریزی قوم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر شکل سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈ نکالتی ہے۔ جس قدر زیادہ پر خطر موقع ہو، اسی قدر ان کی سیاست زبردست

ہوتی ہے۔ مجھے وزیر اعظم مسٹر ایس کوٹینتھ کا مقولہ رہ رہ کر یاد آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انگریزی قوم کی تاریخ پڑھو تو تم کو یہ معلوم ہو گا کہ ہم نے کوئی لڑائی نہیں جیتی۔ مگر کوئی جنگ نہیں ہاری۔ انگریز یہ سمجھ چکے تھے۔ کہ افغانستان کا حملہ ان کی موت کا پیغام ہے۔ اس لئے انہوں نے چال بازی سے وہ کام نکالا۔ جو وہ ہتھیار سے نہ نکال سکتے تھے۔ کابل کے سب سے بڑے پیر جن کا نام میں ارادۂ چھوڑتا ہوں۔ افغانستان میں بہت بڑے روحانی پیشوا مانے جاتے تھے۔ اور خود اعلیٰ حضرت بھی ان سے سمیت تھے۔ اب ان کو انگریزوں نے بلایا اور بہت بڑا لالچ دے کر ان کو اس بات پر آمادہ کیا اور کابل جا کر امیر صاحب کو جنگ کے ارادے سے باز رکھیں۔ پیر صاحب کابل پہنچے اعلیٰ حضرت ان کی قدمبوسی کے لئے ان کی فرودگاہ پر شریف لے گئے۔ اور ان سے تمام منصوبے کا ذکر کر کے دعا کے طالب ہوئے۔ پیر صاحب نے فرمایا کہ میں تین دن تک استخارہ کروں گا اور پھر چوتھے روز تم کو اس کا جواب دوں گا۔ ہمارا ماتھا فوراً ٹھنکا۔ جلدی سے ایک مجلس مشاورت منعقد کی گئی اور یہ فیصلہ ہوا کہ اگر اعلیٰ حضرت اس تجویز کو بدل بھی دیں تو بھی اپنے ارادے سے باز نہیں آئیں گے۔ بلکہ کمیشن کے تمام ممبر یاغستان پہنچ کر لوگوں کو منظم کر کے ہندوستان پر حملہ کر دیں گے۔

اس عرصے میں مولانا سندھی بھی معمولی اختلافات کی بنا پر ہم لوگوں سے ناراض ہو گئے تھے۔ انہوں نے محمود طرزی سے راہ و رسم نکالی تھی۔ وہ امیر حبیب اللہ خاں کے معتب اور اپنے تفریح کی وجہ سے بدنام تھے۔ ان کی بڑی بیٹی عنایت خاں کی اور منجھلی بیٹی۔ امان اللہ خاں کی بیوی تھیں جو بعد میں ملکہ فرتیا بنیں۔ لیکن طرزی نے غالباً مولانا سندھی مرحوم کی تحریک سے اپنے بڑے داماد یعنی وسیعہ صاحب کو ہم سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر خدا کی شان ان کی ہر کوشش کا نتیجہ اٹا نکلا۔ یہاں تک کہ پیر صاحب مفسر شہود پر شریف لائے۔ پیر صاحب نے استخارہ کے بعد امیر صاحب کو

یہ بتلایا کہ ہندوستان پر حملہ کرنا افغانستان کی تباہی کو دعوت دینا ہے۔ محمد علی عینی راقم الحروف افغانستان کا دشمن ہے۔ اس کو افغانستان سے فوراً نکال دینا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ امیر صاحب کو آٹھ کروڑ روپے کا لالچ دیا گیا اور پچاس لاکھ روپیہ پیر صاحب کو اس کارکردگی کے صلے میں ملا۔ پیر صاحب کے اس فیصلے کا اثر نائب السلطنت صاحب اور سپہ سالار نادر شاہ مرحوم پر بہت ہوا۔ اور ان دونوں صاحبوں نے علانیہ اعلیٰ حضرت سے کہا کہ اگر آپ نے جرمن وفد کو انگریزوں کے حوالے کیا یا مولوی محمد علی کو کسی قسم کی سزا دی تو ہم سب مخالفت کریں گے اور ملک میں ہنگامہ ہو جائیگا۔ شاید اسی لئے امیر صاحب روپیہ لینے کے باوجود اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانہ سکے۔ ادھر ہم نے یہ تجویز کی کہ میں افغانستان سے غائب ہو جاؤں تاکہ انگریزوں کو امیر صاحب کے خلاف اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔ چنانچہ مجھے افغانستان کا وکیل مختار بنا کر جرمنی بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ میں نے ملازمت سے استعفا دے دیا۔ اور جرمنی جانے کی تیاری شروع کی۔

اس عرصہ میں کابل کے بعض ارباب اقتدار کے اشارہ سے میرے گھر پر تلخ ڈاکہ پڑا۔ جس میں انھوں نے مجھے قتل کرنے کی سازش کی تھی۔ مگر خوش قسمتی سے میں خود بچ گیا۔ البتہ سامان بمع تمام کاغذات کے چوری ہو گیا۔ نائب السلطنت صاحب اور سپہ سالار نادر شاہ کا خیال تھا کہ یہ ڈاکہ انگریزوں کے ایما سے پڑا۔ اور اس کی تہ میں معین السلطنت صاحب کے سکرٹیری تھے جو محمود بیگ طرزی کے خاص انخاص آدمی تھے۔ واللہ اعلم۔ پھر چند روز کے بعد خود اعلیٰ حضرت کے فرمان سے سو آدمیوں نے میرے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ اور اعلیٰ حضرت کا حکم لا کر دیا کہ تجھے گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر ساتھ ہی کپتان یونس نے نہایت مؤدبانہ لہجہ میں مجھ کو تنہائی میں لیجا کر کہا کہ سپہ سالار نادر شاہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ آپ کو کسی قسم کی تکلیف

نہ دی جائے، بلکہ ہر ممکن سہولت مہیا کی جائے۔ آپ بے شک ہفتہ عشرہ تک یہاں ٹھہریں۔ اور سپہ سالار صاحب سے مل کر تمام پروگرام طے کر لیں۔ پھر اس نے مجھ سے فرمان پر باقاعدہ دستخط لئے، کہ میں اپنے تئیں حوالے کرتا ہوں۔ اور اپنے تمام سپاہیوں کو رخصت کر دیا۔ میں اٹھا اور سیدھا سپہ سالار صاحب کے در دولت پر پہنچا وہاں مجھے تمام سازش کا علم ہوا۔ سپہ سالار صاحب اور ان کے والد ماجد حشیم پُر آب تھے۔ اور فرمانے لگے کہ مولوی صاحب یہ اسلام اور افغانستان کی بد قسمتی ہے کہ آپ کو اس طرح سے نکالا جا رہا ہے۔ لیکن ہم آپ کو انگریزوں کے ہاتھ میں نہیں پڑنے دیں گے۔ اس کے بعد میں سپہ سالار صاحب کے ہمراہ نائب السلطنت صاحب کے دولت خانے پر پہنچا۔ نائب السلطنت صاحب نے فرمایا کہ میں نے تمہارے یاغستان جانے کا انتظام کر دیا ہے۔ پھر فون ہنگ۔ راجہ مہندر پرتاب۔ اور مولانا برکت اللہ سے طویل مشورت کے بعد یہ طے پایا، کہ میں ملا بشیر کی معیت میں یاغستان چلا جاؤں۔ اور قبائل کو منظم کر کے انگریزوں پر دھاوا بولوں۔ نائب السلطنت صاحب نے وعدہ فرمایا کہ وہ جرمن مشن کے بعض ارکان کو وہاں بھیجیں گے تاکہ قبائل کی تنظیم کا کام پورا اور مکمل کیا جاسکے۔ خود انہوں نے اسلحہ اور سامان مہیا کرنے کا وعدہ فرمایا۔ بعض وجوہات کی بنا پر جن کا ذکر آگے آئے گا۔ جرمن وفد کے ارکان اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔ میرے لئے یہ سخت امتحان کا وقت تھا۔ کیونکہ اس انقلابی تحریک میں گود کر پھر واپسی کا کوئی امکان نہ تھا۔

مولانا سندھی کو میری روانگی کا علم ہوتے ہی اپنے کئے پر پشیمانی ہوئی۔ اور وہ بہت روئے۔ اور نہایت فراخ دلی سے مجھے گلے دگا کر آئندہ تعاون کا یقین دلایا۔ اس لئے میں نے نصف اثاثہ آئندہ انقلابی پروگرام میں خرچ کرنے کے لئے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اور خود صرف تین پونڈ لے کر اپنا تمام سامان کابل میں

چھوڑ کر ملا بشیر کی معیت میں جون ۱۱۶۷ء میں کابل سے خفیہ نکلا۔ اور ایک ہفتہ کی
 نہایت دشوار گزار مسافت طے کر کے یاجستان میں ملا بشیر صاحب کے مستقر پر
 پہنچ گیا۔

دریں دریائے بے پایاں۔ دریں طوفان موج افزا
 دلِ افگندیم بسم اللہ بحرِ یہا دُمرسا ہا

کابل کے بعد

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

کابل سے نکلے ہوئے مجھے کچھ اوپر پینتیس (۳۵) سال گزر چکے ہیں۔ اس
 لئے اس وقت جو جذبات میرے سینے میں موجزن تھے، ان کا صحیح نقشہ کھینچنا نہ صرف
 مشکل بلکہ قریباً محال ہے۔ لیکن بعد کی ناکامیوں اور تلخ تجربوں نے ان جذبات کے
 بعض نقوش کو بہت پختہ کر دیا ہے۔ اور میں اب تک بعض ناکامیوں کی تلخی محسوس
 کرتا ہوں جس کی وجہ سے وہ نقوش زخم تازہ کی مانند ہر وقت ہرے رہتے ہیں لیکن
 اس قدر میں ضرور کہوں گا کہ کابل جاتے وقت اور کابل سے نکلنے وقت دو جذبات
 نہایت شدت سے میرے سینے میں موجزن تھے اور بعد کے تجربوں نے انہیں اور
 پختہ کر دیا ہے۔ ایک تو یہ کہ مسلمان اقوام کے لئے ایک ہی راہِ نجات ہے اور وہ
 یہ کہ مغربی استعمار سے مکمل آزادی حاصل کرنے کے ساتھ خود اپنے قومی اور ملکی جابر
 حاکموں کے پنجہ استبداد سے بھی آزاد ہوں۔ بعد کے تلخ تجربات نے اس یقین کو اور

پختہ کر دیا ہے کہ عام انگریزی خواں طبقہ کا خیال کہ مغربی طاقتوں کی غلامی سے نجات ہی مسلمانوں کے درختاں مستقبل کی کلید ہے بالکل بے اصل ہے جب تک مسلمان اپنی اندرونی اصلاح کر کے ایک صحیح اسلامی جمہوری سلطنت قائم کر کے مسلمان جبابرہ کے دستِ تظلم سے نجات حاصل نہ کر لیں۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جس نے ہماری تمام ملت کی زندگی کو مسموم کر دیا ہے اور ہم حقیقی ترقی کی بجائے صرف خوش نما الفاظ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کابل میں مجھے "اسلامی حکومت" "اسلامی شریعت کی فرمائروائی" اور "اسلامی اخوت" کا بڑا تلخ تجربہ ہوا۔ یعنی بحیثیت خود میں نے دیکھا کہ وہاں کس طرح "بادشاہ اسلام" "سلطنت اسلام" اور "ملت اسلامیہ" کے الفاظ کو مانتے المسایم کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لئے استعمال کیا جا رہا تھا اور افغانستان کے خود ہیں اور خود غرض رؤسا محض اپنی مطلب براری کے لئے "اسلام کی محبت" اور "اسلام کا نلبہ" کے دل خوش کن نعرے استعمال کر رہے تھے۔ مجھے سب سے پہلے افغانستان میں اس تلخ حقیقت کا تجربہ ہوا تھا کہ جب افغانی زعماء (معدودے چند مستثنیات کے سوا) کے سامنے اسلام کا نام لیا جاتا تھا تو وہ بظاہر بہت جوش و خروش کا اظہار کرتے تھے مگر دریلب تبتم سے ہماری حماقت پر تعجب کرتے تھے اور ہمیں فرسودہ خیال لوگ سمجھ کر ہم پر حقارت کی نظر ڈالتے تھے کہ۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

اور عامۃ الناس کچھ ان احکام کی چیرہ دستیوں کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ وہ اس ظلم و ستم کو اسلامی حکومت کا خاصہ خیال کرتے تھے اور ان تمام بدعنوانیوں کو جو امر کی طرف سے ان پر ہوتی تھیں نہایت صبر و سکون سے برداشت کرتے تھے اور یہ کہہ کر اپنا دل بہلا لیتے تھے کہ "نومشۃ تقذیر یونہی تھا" "اللہ تعالیٰ

کی مرضی یونہی تھی کہ ہم ان مظالم کا تختہ مشق بنے رہیں۔ ”جب اس کا حکم ہوگا تو یہ ظالم بادشاہ خود بخود درست ہو جائیں گے“ وغیر ذلک۔ اس لئے کابل کے قیام نے مجھے اپنے اس عقیدہ میں اور بھی پختہ کر دیا تھا کہ مسلمانوں میں کوئی صحیح بیداری نہیں پیدا ہو سکتی جب تک کہ عامۃ الناس میں سیاسی اور اخلاقی شعور پیدا نہ کیا جائے گا اور وہ تعلیم سے آراستہ ہو کر اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے نہ لگیں گے۔

غرض کچھ ایسے قسم کے خیالات و عزائم کو لے کر میں غالباً جون ۱۹۱۶ء میں کابل سے ڈارہ نو کر نہایت دشوار گزار راستوں سے چھپ چھپا کر کنٹرول میں پہنچا وہاں حضرت سید جمال الدین افغانی کے پوتے حضرت سید عبدالقادر صاحب عرف بادشاہ صاحب کنٹرول کا مہمان ہوا۔ انھوں نے مجھے سینے سے لگایا اور کہا کہ ”تم میرے بیٹے ہو۔ اور میری پناہ میں ہو۔ امیر حبیب اللہ کی مجال نہیں کہ تم پر دست درازی کر سکے“ وغیر ذلک۔ کنٹرول ایک نہایت زرخیز علاقہ ہے۔ خود رو میوہ دار درخت اور سبزہ نے اسے رشک جناں بنا دیا ہے۔ دریائے کنٹرول کا پانی سونا اگلتا ہے اور اس کے چاروں طرف بسنے والے لوگ خوش حال اور آسودہ ہیں۔ کنٹرول میں نے سب سے پہلے اپنا علیہ تبدیل کیا یعنی سوٹ بوط اتار کر جبہ و دستار اور یاغستان کے ملاؤں کا لباس اختیار کیا۔

کنٹرول اور یاغستان کے درمیان صرف ایک بلند پہاڑ حائل ہے جس پر میوؤں کے درخت اور سبزہ زار بکثرت ہیں۔ پہاڑ کی چڑھائی خاصی سخت ہے یہی پہاڑ ڈیورنڈ لائن (Durand Line) کی سرحد ہے۔

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈیورنڈ لائن اور یاغستان کے متعلق چند مزید معلومات پیش کر دی جائیں۔ کیونکہ ہمارے تمام انقلابی کام کا محور یہی علاقہ رہا ہے۔

انگریزی حکومت کے ہندستان میں قیام کے بعد اس کی افغانستان سے آئے دن چپقلش رہتی تھی۔ بالآخر انگریزوں نے امیر عبدالرحمن کو کابل کے تخت پر بٹھلایا اور ان سے معاہدہ کیا کہ وہ ہندستانی سرحدوں پر افغان قبائل کی یورش کی روک تھام کرتے رہیں گے اور اس کے صلے میں انھیں بارہ لاکھ سالانہ وظیفہ دینا منظور کیا۔ امیر عبدالرحمن مرحوم نہایت جابر بادشاہ تھے۔ انھوں نے افغانوں کی روح آزادی کچلنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ لیکن پھر بھی وہ ان حملوں کی کما حقہ روک تھام نہ کر سکے۔ ان حملوں کے نتیجے کے طور پر ہمیشہ سرحدی تنازعات پیدا ہوتے رہتے تھے۔ اس لئے انگریزوں نے ۱۸۸۹ء میں سرسہری مارٹر ڈیو رینڈ کی سرکردگی میں ایک مشن کابل روانہ کیا تاکہ امیر صاحب کے ساتھ ہند اور کابل کی سرحد کا تعین کرے۔ اس کمیشن نے افغانستان کی مشرقی اور جنوبی سرحدات کی تعین کی اس خط کا نام "ڈیو رینڈ لائن" ہے۔ یہ لائن کنٹر کے پہاڑ سے شروع ہو کر درہ خیبر اور علی مسجد کے پہاڑ تک پھیلی ہوئی ہے اس معاہدے کی رو سے امیر کابل کا وظیفہ بھی بڑھا کر اٹھارہ لاکھ روپیہ سالانہ کر دیا گیا اور وہ تمام علاقہ جو یاغستان یا آزاد علاقہ کہلاتا تھا انگریزی حلقہ اثر میں لے لیا گیا اور امیر افغانستان نے اس علاقہ سے دست برداری لکھاری۔ اس سے ایک طرف تو کوئٹہ اور بولان پاس **Bolan** یعنی کوہاٹ و بہادر خیل کی حفاظت اور دوسری طرف پشاور، شب قدر اور بہشت نگر کے سرحدی علاقوں کو لوٹ مار سے محفوظ کرنا مقصود تھا۔ اس معاہدہ کی رو سے اس علاقہ میں انگریزوں نے فوجی مورچے بنانے شروع کئے اور اپنی روایتی "پرامن نفوذ" کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے یاغستان کے ملکوں اور سرکردہ لوگوں کے وظائف مقرر کر دیئے اس شرط پر کہ وہ نیک چلن رہیں اور انگریزی استحکامات کو ٹھہرا رکھیں، چمن، شب قدر وغیرہ پر حملہ نہ ہونے دیں گے۔ انگریزی حکومت

سالانہ دو کروڑ سے زائد روپیہ اس طرح خرچ کرتی تھی۔ اور جہاں کسی قبیلہ یا ملک نے "سرکشی" کا رجحان ظاہر کیا فوراً اس کا منہ سُنہری لقمے سے بھر دیا جاتا تھا۔ یاغستانی بھی انگریزی حکمت عملی کو خوب سمجھتے تھے اور وہ آئے دن چھپڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے تاکہ انگریزوں سے مزید مطالبات منواتے رہیں۔ انگریز بھی پے در پے روپیہ صرف کرتے تھے اور ایک محکمہ خاص اس غرض کے لئے قائم تھا۔ جس کی داد و دہش ہر قسم کی نتیجے سے بے نیاز تھی۔ غرض ہر سال یہ قبائلی معاہدہ شکنی کرتے تھے اور ہر سال صلح کرتے تھے اور مزید وظائف سے مالا مال ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام علاقہ اعدیوں اور لٹیروں کا مسکن بن گیا ان کی یہ عادیں اس درجہ راسخ ہو چکی تھیں کہ اب وہ ایک دوسرے پر بھی ڈاکہ ڈالنے میں تامل نہ کرتے تھے۔ ڈاکوں وغیرہ کی وجہ سے ان میں عربوں کی رسم و رنجار بھی جاری ہو چکی تھی۔ اور اگر کسی قبیلہ کا آدمی مارا جاتا تو وہ تمام قبیلہ اس کا قصاص لینا۔ اپنا اخلاقی اور خاندانی فرض سمجھتا تھا۔ انگریزوں کی اس داد و دہش نے خود یاغستان کو بھی دو بالکل مختلف اور متضاد گروہوں میں بانٹ دیا تھا۔ جو طبقہ انگریزی اثر میں تھا وہ تو ہر قسم کی حقیقی اسلامیت سے عاری، اور لوٹ مار کا عادی ہو چکا تھا۔ دوسرا طبقہ جو انگریزی اثر و نفوذ سے باہر تھا اپنی اسلامی روایات پر نہایت سختی سے کاربند تھا۔ ان کی دیانت اور نیک چلنی ضرب المثل تھیں۔ یہ تفاوت اس قدر نمایاں تھا کہ شروع شروع میں مجھے حیرت ہوتی تھی۔

قصہ مختصر ہمارا قافلہ کنٹر کے پہاڑ کو عبور کر کے یاغستان یا آزاد علاقہ میں داخل ہوا۔ کنٹر کے ملحقہ علاقہ کا نام چمرکنڈ ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی بسی اس پہاڑ کے یاغستانی طرف واقع ہے اور کوئی چار ہزار فٹ سطح سمندر سے بلند ہے۔ شکل سو کے قریب گھربوں گے بسی سے الگ ایک خاصی وسیع مسجد واقع ہے جو ملا

ہاڈا صاحب کی مسجد کہلاتی ہے۔ اس کے ساتھ مجاہدین پنجاب کی بستی ہے۔ اس مسجد اور درگاہ کے متولی شیخ چمرکنڈ کہلاتے ہیں اور چونکہ وہ ملا صاحب ہاڈا کے جانشین سمجھے جاتے ہیں اس لئے قرب و جوار کے تمام علاقوں میں ان کی خاصی عزت ہے۔

ملا صاحب ہاڈا جنہیں انگریزوں نے ”دیوانہ ملا“ کا لقب دے رکھا تھا حضرت سید احمد صاحب بریلوی کے خاص خلفاء میں سے تھے اور انہی سے انہیں شوق جہاد و رشتہ میں ملا تھا۔ ان کی تمام عمر انگریزوں کے خلاف جہاد میں گزری تھی۔ جہاد ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وہ تمام عمر انگریز کے خلاف نفرت و حقارت کے بیج بوئے رہے اور قبائل کو لشکر کشی پر اکساتے رہے۔ میں نے اس خیال سے کہ ملا صاحب پاڈامرحوم و مغفور کی ساری زندگی اسی مقدس فریضے کی ادائیگی میں بسر ہوئی جس کو میں اپنا مقصد حیات بنا کر یاغستان آیا تھا وہیں ملا صاحب کی مسجد میں قیام کرنے اور یاغستان کے حالات کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ شیخ چمرکنڈ نے جو پرانی وضع کے بزرگ شخص تھے میرے لئے ایک حجرہ مخصوص کر دیا۔ شیخ ابراہیم مرحوم بھی میرے ساتھ مقیم ہو گئے۔ میں نے اپنے مجاہد بھائیوں کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے اپنا نام بدل کر۔ ”محمد سلیمان“ رکھا۔ میرے ساتھ علاؤ شیح ابراہیم مرحوم کے تین پنجابی طلبا بھی تھے۔ یہ مخلص نوجوان ان پندرہ ہاجر طلبا کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

کابل سے روانگی کے وقت ایک مجلس مشاورت منعقد ہوئی جس میں جرمن مشن کے اراکین۔ ولانا عبید اللہ سندھی مرحوم، ملا بشیر مرحوم اور بعض ہاجر طلبا شریک ہوئے تاکہ یاغستان کے متعلق ایک مفصل منصوبہ مرتب کر لیا جائے۔ جرمن وفد کی رائے تھی کہ مولانا سندھی مرحوم کو یاغستان چلے جانا اور وہاں کے تمام کام سنبھالنے چاہئیں۔ لیکن مولانا سندھی مرحوم نے صاف انکار کر دیا کہ میں

ایسے وحشی اور غیر متعذر علاقے میں جا کر قیام نہیں کر سکتا۔ البتہ کابل میں ہی رہ کر اس تحریک کی قیادت سبھال لوں گا۔ لیکن ملا بشیر صاحب نے جو یاغستان کے حالات سے سب سے زیادہ واقف تھے کہا کہ تحریک کی قیادت اس شخص کے ہاتھ میں ہونی چاہیے جو خود وہیں اقامت اختیار کرے کیوں کہ لڑائی میں ہمیشہ قضیہ زمین برسر زمین ہوا کرتا ہے۔ غرض بہت رد و کد کے بعد اس بات پر سب کا اتفاق ہو گیا کہ میں یاغستان کی تحریک کی قیادت ایک وقت تک سبھال لوں اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم صدر مدرس دیوبند کو دعوت دی جائے کہ وہ یاغستان آکر اس تمام تحریک کی قیادت کی عنان سبھال لیں۔ حضرت شیخ الہند کا اثر یاغستان میں مسلم تھا کیونکہ وہاں کے اکثر ملا اور آئمہ مساجد ان کے شاگرد تھے۔

غرض میں شیخ محمد ابراہیم، چند مہاجر طالب علم کابل سے نکل کر یاغستان پہنچے اور ملا ہاڈا صاحب کی مسجد کے زیر سایہ مقیم ہو گئے۔ یاغستان کے اس علاقے میں جہاں میں نے اپنا مستقر بنایا میں بڑے اور صاحب اثر ملا تھے جن میں سے ہر ایک اپنے اقتدار کا خواہاں تھا اور ایک دوسرے سے تعاون کو اپنی کسر شان اور منہک سمجھتا تھا۔ یہ ملا حاجی صاحب ترنگزائی، ملا صاحب باہرا اور سندا کے ملا صاحب تھے۔ مگر یہ تینوں ملا صاحب ہاڈا کے حریفوں میں سے تھے یا ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ اور اس عقیدت کی وجہ سے شیخ چمرکنڈ کو جو ملا صاحب کے سجادہ نشین سمجھے جاتے تھے۔ عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یوں بھی شیخ چمرکنڈ بالکل مرغان مرغ قسم کے انسان تھے۔ جنہیں علویا لیدی ری کی ہوس نہ تھی، اس لئے چمرکنڈ میں میرا قیام بہت مناسب رہا۔ اور تینوں بڑے ملا صاحبان نے مجھے غیر جانبدار انگریزی خواں عالم تصور کیا اور میری آمد کو کسی خاص خطرے کے ساتھ منسوب نہ کیا۔ بلکہ میرے آنے سے پہلے ہی یاغستان میں میری شہرت پہنچ چکی تھی اور وہ یہ کہ "لوئے مولوی" یعنی بڑا

مولوی (پرسپل) کابل سے بھاگ کر قبائل میں آ گیا ہے۔ اس لئے جو نہی میں پہنچا تو دور
 و نزدیک سے لوگ مجھے دیکھنے کے لئے جوق در جوق آنے لگے۔ اس ضمن میں بعض لطیفے
 مشاہدہ میں آئے۔ مثلاً ایک دن میں صحن مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک بڈھا آیا اور نہایت
 تعجب سے پکار اٹھا کہ ”واہ میری قدرت یہ لوئے مولوی بھی تو ہماری طرح کا انسان
 ہی ہے“ ایک دن ایک بڈھا اپنے فرزند کے ساتھ میری زیارت کے لئے آیا۔ رطکے
 نے مجھے دیکھتے ہی کہا ”کہ بابا دیکھو لوئے مولوی کی چار آنکھیں ہیں (میں عینک لگایا
 کرتا تھا) دو اصلی اور دو شیشے کی“ باب بہت عقلمند تھا۔ کہنے لگا نہیں بیٹا یہ لوئے
 مولوی اندھا ہے۔ شیشے کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور یہ فرنگی کا کمال ہے“ میں
 فارسی میں گفتگو کرتا تھا اور ترجمان پشتو میں ترجمہ کرتا تھا۔ اب یہ سیدھے سادے
 لوگ آتے اور حیرت سے پوچھتے کہ ”ہیں یہ لوئے مولوی کیسا ہے پشتو نہیں جانتا“
 ان کے خیال میں کسی عالم کے لئے اور بالخصوص ”بڑے عالم“ کے لئے یہ ممکن ہی نہ
 تھا کہ وہ پشتو نہ جانے۔ چنانچہ ہمارے ترجمان نے یہ کہہ کر کہ لوئے مولوی صاحب
 ”کتابی پشتو میں بات چیت کرتے ہیں جو تم لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے“ ان کی تسلی
 کی اور ایک بڈھے نے کہا کہ ”ہاں اب یہ بات سمجھ میں آتی ہے“

یاغستان کے جغرافیائی محل وقوع نے اس کی سیاسی اہمیت بہت بڑھادی تھی۔
 پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے انگریز اپنی پُر امن نفوذ کی پالیسی کو قریباً ترک کر چکا تھا۔
 نفوذ کی بجائے صرف وظائف کا زور تھا۔ خود ہندوستان کی تمام فوجیں فرانس
 جا چکی تھیں اور ہندوستان جیسا وسیع و عریض ملک اسلحہ سے اور سامان حرب
 اور انگریزی و ہندوستانی فوجوں سے قریباً خالی ہو چکا تھا۔ یاغستان کے جنگجو
 لوگ نہ صرف جنگ کے خوگر تھے۔ بلکہ کافر کے خلاف جہاد ان کا محبوب مشغلہ تھا۔
 ادھر انگریز کی یہ حالت تھی کہ ذرا سے حملہ کے اندیشہ سے وہ اس قدر خائف ہو جاتا کہ

لاکھوں روپیہ صرف کر دینا اس کے لئے معمولی بات تھی۔ ہم نے کابل میں یہی پروگرام مرتب کیا تھا کہ یاغستان کو انگریزوں سے توڑ کر امیر کابل سے جوڑا جائے اور امیر صاحب کی وساطت سے انھیں مسلح اور منظم کر کے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے فوج تیار کی جائے۔ یاغستانیوں کے فوجی اوصاف اور ان کی جنگی روایات اس بات کی شہادت دیتی تھیں کہ یہ لوگ ہندوستان سے کھر کونا بود کرنے میں سلام کا قوی باز و ثابت ہوں گے۔

سیکیم تو مکمل تھی مگر اس کی مثال شہزادے کے بغیر ہیملٹ کے ڈراما کی تھی۔ اور بعد میں ہمیں یقین ہو گیا کہ امیر حبیب اللہ کی بزدلی، ان کی انگریزوں سے مرعوبیت کسی جرأت مندانہ تجویز کو بروئے کار لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ یہاں یہ عرض کر دینا تجنیس حاصل ہے کہ یہ سارا منصوبہ افغان دماغ کی فکر کا نتیجہ نہ تھا، کیونکہ افغان دماغ تو اس قسم کی دوراندیشی سے کوسوں دور تھا اور ہے اس کی تہی دامنی کا اس سے بہتر ثبوت اور کیا مل سکتا ہے کہ اب جبکہ حالات بالکل الٹا چکے ہیں اور انگریزوں کے بجائے خود مسلمان جو سیکیم کے مجوز تھے پاکستان کے مالک بن چکے ہیں اور یاغستان کا اصلی مقصد کہ مسلمان اپنے حاکم ہوں، حال ہو چکا ہے، افغان وہی پرانا ڈھول پیٹ رہے ہیں اور ہندوؤں کی رضا جوئی کے لئے وہ کام کر رہے ہیں جو انھیں نہ کرتا چاہیے۔

قصہ کوتاہ ہم ایک مکمل سیکیم نے کریاغستان میں داخل ہوئے تھے اور وہاں پہنچے ہی ہم نے اسے کامیاب بنانے کی تدبیر شروع کی۔ کوشش یہ تھی کہ یاغستان کو منظم و مربوط کر کے انگریزوں کے خلاف پشاور سے کوئٹہ تک بہ یک وقت گوریلا لڑائی شروع کر دی جائے اور ان کی فوجوں کو مصروف رکھا جائے، یہاں تک کہ امیر افغانستان باقاعدہ لشکر کشی کر کے ہندوستان کو ہوم رول دینے کا اعلان کر دیں۔

اس منصوبے کی کے لئے سب سے پہلا قدم یاغستانی ملاؤں کا اتحاد عمل تھا۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے اسی طرف قدم اٹھایا اور پہلے حاجی صاحب ترنگزائی کی دعوت قبول کر لی۔ چنانچہ ۲۹ رمضان کو چمکنٹ سے حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ میرے ساتھ ملا بشیر، شیخ ابراہیم اور دوسرے ہمراہی تھے۔ حاجی صاحب نے نہایت پر تپاک خیر مقدم کیا۔ ان کے صاحبزادے "بادشاہ گل" نے (جو آج کل ان کے جانشین ہیں اور غالباً پشاور میں مقیم ہیں) ہمارا استقبال کیا۔ شام کو افطار کے بعد آئندہ طریق کار کے متعلق بڑی مفصل گفتگو ہوتی رہی۔ حاجی صاحب ایک آن پڑھ مگر نہایت مجھدار اور دور اندیش بزرگ تھے باوجود پیرانہ سالی کے جہاد کے جوش میں گھر بار چھوڑ کر یہاں ایک جنگل میں آکر جم گئے تھے۔ حاجی صاحب ہشت نگر ضلع پشاور کے بہت بڑے پیر تھے اور سرکار انگریزی کے ہاں کرسی نشین تھے۔ مگر جوہنی انگریزوں نے ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کیا ان کی رگ حمیت بھڑک اٹھی اور فوراً ہجرت کر کے یاغستان چلے گئے اور وہاں جہاد کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ ان کی آمد سے یاغستان میں دوسرے ملاؤں کا چوکنا ہونا ایک قدرتی امر تھا کیونکہ یہ بھی ان کے پائے کے پیر تھے اور ان کے مریدین کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ اس لئے حاجی صاحب کے یاغستان میں آکر جم جانے سے اس امر کا خطرہ تھا کہ ان کا ایک مد مقابل پیر پیدا ہو گیا ہے لیکن میں یہاں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ ان لوگوں میں گو علم نہیں تھا مگر صحیح اسلامیت تھی۔ یہ ملا ہاڈا صاحب اور حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فیوضات کا اثر تھا کہ ان کی مخالفت علانیہ نہ تھی اور نہ اصول جہاد سے اعراض کی وجہ سے تھی۔ اس بات نے ان کا اتحاد ممکن کر دیا تھا۔

میں نے چمکنٹ میں داخل ہوتے ہی اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب چونکہ بظاہر حالات مجھے اپنی بقیہ زندگی اپنی بددلوگوں میں بسر کرنی ہے۔ اس لئے ان

لوگوں کا تمدن اور رہن سہن کا طریق اختیار کر لینا چاہیے تاکہ ان لوگوں کو اجنبیت نہ محسوس ہو اور میں بھی ان سے اجنبیت محسوس نہ کروں۔ چنانچہ پہلے دن جب ہمارا قافلہ چمرکنڈ پہنچا اور جماعت مجاہدین کے کیمپ میں شیخ چمرکنڈ کے مہمان کے طور پر اترے تو پٹھانی دستور کے مطابق شیخ چمرکنڈ نے رات کو ہماری "بڑی شاندار" دعوت کی۔ وہ دعوت خالص افغانی طرز کی تھی۔ اس میں چمرکنڈ کے تمام شیوخ شریک تھے۔ ایک دنہ ذبح کیا گیا اور اسے دیہاتی طریق پر پکایا گیا۔ کھانے کے وقت ایک بہت بڑا چوبی لگن لاکر بیچ میں رکھ دیا گیا جو شوربے سے قریباً بھرا ہوا تھا۔ اب شیخ چمرکنڈ نے اس میں تندوری روٹیاں توڑ کر بھگونی شروع کر دیں اور ایک قسم کا "شرید" تیار ہو گیا۔ ہم سب بیٹھ چکے ^{۲۵} مہمان اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ روٹی کا ایک ایک ٹکڑا اور گوشت کا بوٹا رکھ کر کہا گیا کہ بسم اللہ کرو۔ پٹھان مہالوں نے تو آؤ دیکھا نہ تاؤ اس لگن میں ہاتھ ڈال کر کھانا شروع کیا۔ میرے ساتھی رُکے۔ کیونکہ وہ الگ الگ پلیٹوں میں کھانے کے عادی تھے اس لئے ایک ہی برتن میں سے سب کے ساتھ کھانا انھیں ناگوار گذرا۔ مگر میں نے بلا تامل اس لگن میں سے کھانا شروع کر دیا اور اردو میں اپنے دوستوں سے کہا کہ اب تو ہمارا مزاجیتا انھیں لوگوں کے ساتھ ہے اس لئے ہندوستان اور کابل کی رہن اور وہاں کے طور طریق کو بھول جاؤ۔ خیر میرے کہنے پر ان لوگوں نے باول نحو اسے چند لقمے کھائے مگر میں نے دیکھا کہ پٹھان مہالوں نے ان کی بددلی اور میری رنجت کو بھانپ لیا۔ قصہ مختصر میں نے اپنا طور طریقہ اس قدر بدل لیا کہ کوئی شخص مجھے دیکھ کر یہ باور نہیں کر سکتا تھا۔ کہ میں قبائلی زندگی کا عادی نہیں۔ اس چیز نے مجھے حاجی صاحب کے ہاں بھی بہت مقبول بنا دیا۔ حاجی صاحب بار بار یہ فرماتے تھے کہ یہ تو میرا بیٹا ہے۔ دیکھو کیسا اپنے گھر کی طرح سب سے مل گیا ہے۔

دوسرے دن یعنی عید کی نماز پر بہت بڑا مجمع ہونے والا تھا۔ علاوہ دیہاتی

نمازیوں کے ارد گرد کے دیہات کے سب بنگ جن کی تعداد پانصد سے زائد تھی جمع ہوئے تاکہ میری تقریر سنیں اور جو تجویز میں جرمن مشن کے مشورے سے طے کر کے آیا تھا اس کی تفصیلات سے آگاہی حاصل کریں۔ حاجی صاحب نے یہ فیصلہ فرما دیا تھا کہ عید کی نماز بھی میں پڑھاؤں اور اس کے بعد وعظ بھی کہوں۔ مجھے یاد ہے کہ وہ رات بڑے اضطراب سے کٹی کیوں کہ میں محسوس کر رہا تھا کہ یاغستان میں یہ میل پہلا قدم تھا اور بہت کچھ اس کی کامیابی پر میرے مشن کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار تھا۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہوا کہ انگریزوں نے اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ میرے مشن کو ناکام بنا لیں اور یاغستان میں اتحاد نہ ہوئے وہیں۔

عید کی نماز کے وقت غیر معمولی جمع تھا۔ شیوخ و خواتین کے علاوہ جو خاص طور پر مدعو تھے لوگ بہت بڑی تعداد میں میلوں چل کر "لوئے مولوی" کی پہلی غام تقریر کو سننے آئے تھے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ میں انگریز کے خلاف بولوں گا۔ میری تقریر اردو میں تھی اور ترجمان مولوی فضل محمود مرحوم تھے۔ مولوی صاحب دیوبند کے فارع التحصیل اور حاجی صاحب کے خاص آدمی تھے۔ ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے۔ اور وہی میرے سب سے اچھے ترجمان ثابت ہوئے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے قرآن حکیم کی مشہور آیت۔

کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنہون
عن المنکر و تؤمنون باللہ۔

"تم لوگوں میں سے بہترین امت پیدا کئے گئے ہو۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو

اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو"

سے تقریر شروع کی جو دو گھنٹے جاری رہی۔ لوگوں پر اس کا بہت زیادہ اثر ہوا

اور اس کا اظہار اس طرح بھی ہوا کہ چار دفعہ مجھ سے درخواست کی گئی کہ "ذرا ٹھہریے"

میرے رکنے پر ایک بوڑھا ملک کھڑا ہوتا اور کہتا کہ "مولوی صاحب کے لئے دعائے خیر کرو کہ خدا انہیں نظر بد سے بچائے" غرض تقریر نے وہی کام کیا جو مٹی کے تیل پر دیا سلائی کرتی ہے۔ لوگوں کی آتش انتقام بھڑک اٹھی اور بہت سے لوگوں نے تلواریں نیام سے نکال لیں اور زور زور سے کہنے لگے کہ "مولوی صاحب! حکم دیجئے تاکہ ہم اس..... فرنگی کا سر قلم کر دیں" تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ تاریخ نہیں صلیبی لڑائیوں کے وقت سے لے کر اب تک انگریز ہمیشہ مسلمانوں سے برسری بیکار رہے ہیں۔ انہی نے افریقہ کو ہمارے ہاتھوں سے چھینا، ہندستان کا وسیع و عریض ملک مسلمانوں سے لے لیا اور اب ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر کے اس کے حصے بخرے کرنا چاہتے ہیں، اور اسلام کی آخری ٹمٹاتی ہوئی تمیح کو بھی بچانے کے درپے ہیں۔ اس لئے ہر مومن صادق کا فرض ہے کہ ہر ممکن طریق پر انگریزی استعمار کے خلاف صف آرا ہو۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے خود متحد ہو جائیں۔ انگریز کی حکمت عملی یہی رہی ہے کہ وہ ہمیشہ ہم میں پھوٹ ڈلو کر خود ہمارے ہاتھوں، ہمیں تباہ کرتا ہے۔ یہیں چاہیے کہ اپنے اختلافات ختم کر کے انگریز کے خلاف متحد ہو جائیں۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ تمام افغان قبائل کو امیر افغانستان کے جھنڈے تلے جمع کر کے انگریزوں کے خلاف چڑھائی کروں اور ہندستان پر پھر ایک دفعہ ہلال کا جھنڈا ہرانے لگے۔

تقریر ختم ہوئی تو احسنت، مرجا کا شورا اٹھا۔ تمام لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر میری درازی عمر کی دعا کی اور بالاتفاق کہا مجھے امیر جہاد مقرر کیا جائے۔ اس پر میں نے کہا کہ میں آپ کی عزت افزائی کا بہت مشکور ہوں لیکن حاجی صاحب اور ملا صاحب باہرا اور سنڈا کے ملا صاحب جیسے آزمودہ کار مجاہدین کے ہوتے ہوئے میں اپنے میں یہ جرات نہیں پاتا کہ میں امیر ہوں۔ میری تجویز یہ ہے کہ آپ

لوگ اپنے اپنے حلقے کا الگ الگ امیر جہاد مقرر کر لیں۔ آپ کے حلقے کے لئے میں جناب حاجی صاحب نرگزیانی کا نام نامی تجویز کرتا ہوں اور باہرا کے علاقہ میں جناب ملا صاحب کا صوت کے علاقہ کے لئے سندھ کے ملا صاحب کا۔ سب لوگوں نے بالاتفاق اس تجویز کو پسند کیا اور وہاں کے ملوک و شیوخ اور عامۃ الناس نے حاجی صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعتِ جہاد کی۔ وہ نظارہ ایسا ناقابل فراموش تھا کہ اس کی گرمی اور جوش مجھے اب تک یاد ہیں۔ اور میں کئی دفعہ اپنے ذہن میں اس یاد کو تازہ کر کے سوچتا ہوں کہ مسلمان میں اب بھی اسلام کے نام پر قربانیاں کرنے کا کس قدر ولولہ موجود ہے، مگر افسوس کہ ہمارے پیشوا اور اکابر خود روحِ جہاد سے بیگانہ ہیں، اس سے کام لینا ہی نہیں جانتے۔

میری تقریر کیا تھی، ایک طرف تو "انڈیز عریاں" کا اعلان تھا۔ دوسری طرف انگریزوں سے اپنے خلاف اعلانِ جنگ سمجھا اور یہ خیال کیا کہ اب محض روپیہ سے یہ آگ فرو نہیں ہو سکے گی۔ چنانچہ انھوں نے پہلا کام تو یہ کیا کہ مجھے اشتہاری مجرم قرار دے کر میرے قتل یا گرفتاری کا انعام دس ہزار روپیہ مقرر کیا۔ اور میرے گھر سے (یعنی قصور سے) میرے نوٹوں کو انھیں اشتہاروں پر چسپاں کر دیا۔ لیکن خدا کی شان کہ جس قدر انگریز میری مخالفت اور سرکوبی میں سر توڑ کوشش کرتا تھا اسی قدر میری مقبولیت قبائلی علاقہ میں بڑھ رہی تھی اور میں بے خطر تمام علاقہ میں پھرنے لگا۔ اور تبلیغِ جہاد میں مصروف ہو گیا۔

اس تقریر کے بعد میں واپس چمکنڈ گیا اور قبائل کی تنظیم کی۔ سب سے پہلے میں نے ایک ملٹری ٹریننگ اسکول جاری کیا۔ اس میں قبائلیوں اور مجاہدین کو جن کی تعداد سو کے قریب تھی قواعد سکھلائی اور نشانہ بازی کی مشق شروع کی اس

کے ساتھ ساتھ نوجوان لڑکوں کو آفتاب کی روشنی میں آئینہ سے بات چیت سکھلانی شروع کی۔ ایک پرائمری اسکول جاری کیا جس میں علاوہ دنیوی تعلیم کے دینی تعلیم اور لوگوں کو کتاب و سنت سے روشناس کرایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے ایک دیہاتی ڈسپنسری بھی قائم کر دی اور دیہاتی مریموں کا علاج بھی شروع کر دیا۔ دیہاتیوں میں تہذیب و تمدن کی بیماریاں نہیں ہوتیں کہ ان کی تشخیص کے لئے کسی ماہر ڈاکٹر کی ضرورت ہو۔ میں بہت تھوڑی مشق اور تجربہ کے بعد اچھا خاصا نیم حکیم بن گیا۔ دراصل ان لوگوں کو مجھ پر اس قدر حسن ظن ہو گیا تھا کہ میری قابلیت سے زیادہ ان کی خوش اعتقادی میرے کام آتی تھی۔ ان لوگوں کی سادگی اور سادہ مزاجی واقعی قابل رشک تھی۔ ان کی لاعلمی بھی واقعی انگریزی کی مشہور ضرب المثل کے مطابق ان کے لئے باعثِ رحمت تھی۔ وہ لوگ دغل و فریب سے، جھوٹے ریاکاری، تصنع اور ان تمام برائیوں سے جھپٹیں ہم لوگ تہذیب کا لازمہ خیال کرتے ہیں بالکل نا آشنا تھے۔ بقولِ حالی۔

وہی اپنی فطرت پہ طبع بشر تھی

میری دعوت جہاد آگ کی طرح پھیل گئی اور مختلف دیہاتوں سے میرے پاس وفود آنے لگے، یہ اپنے اپنے گاؤں کی طرف سے بیعت جہاد کرتے تھے اور ہدایات لے کر واپس چلے جاتے تھے۔ میرے ساتھیوں کی آتش بیانی سے ہر طرف جہاد کا غلغلہ بلند ہو گیا۔ اس مصروفیت کے ساتھ ساتھ قبائلیوں کو مصروف جہاد رکھنے کے لئے ہم نے یہ ترکیب کی کہ پشاور کی سرحد پر مسلسل ڈاکے ڈلوانے شروع کئے۔ ان سے ہمیں ایک تو کافی مال غنیمت مل جاتا تھا دوسرے لوگوں کی دشمنی انگریزوں سے دن رات المصاحف ہوتی تھی۔ مجھے خود جب بندوق کی ضرورت ہوئی تو میں وہاں کی ساختہ دیسی بندوق کی بجائے انگریزی رائفل خریدنا چاہتا تھا۔

دوستوں نے کہا کہ بہترین بندوق نہایت آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہے، اور اس کی ترکیب یہ ہے کہ کسی انگریزی مہینے کے آخری ایام میں چھاؤنی سے خرید کر لی جائے کیونکہ جب گورہ محافظوں کے پاس شراب خریدنے کے لئے پیسے نہیں رہتے تو وہ بہترین بندوقیں اور کارتوس کوڑیوں کے دام فروخت کر کے اپنی شراب کی طلب کو پورا کرتے ہیں۔ چنانچہ صرف گیارہ روپے میں مجھے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی میگنیزین رائفل جو غالباً کسی فوجی افسر کی تھی مل گئی۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ وہاں ایک اچھی خاصی تعداد ان بہترین انگریزی رائفلوں کی تھی جو اس طرح حاصل کی گئی تھیں۔

واضح رہے کہ ہم اس طریق کار کے موجد نہیں تھے۔ ڈاکوں کے وہ لوگ ایسے ماہر تھے کہ یہ ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ مگر ہوا یہ کہ جنگ کے دوران میں انگریزوں نے اپنی سرحدات کو مامون کرنے کے لئے بے دریغ روپیہ صرف کر کے ان ڈاکوں کو مامون طور پر بہد کروا لیا تھا۔ ہم نے جا کر اس مہر سکوت کو توڑ دیا اور نئے سرے سے ڈاکے ڈلوانے شروع کر دئے یہ گویا اس امر کا اعلان تھا کہ مارضی صلح (Truce) کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔

اب میرے پاس بفضلہ کافی سرگرم اور جوشیلے نوجوان جمع ہو چکے تھے جن میں سے ہر ایک انقلابی روح سے سرشار تھا۔ ہر انقلابی تحریک کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ جب وہ ایک دفعہ جڑ پکڑ لیتی ہے تو پھر آگ کی طرح پھیتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہمارے مبلغین ہر گانوں میں پہنچتے۔ لوگوں کو جمع کرتے انھیں انگریزوں کے خلاف دعوت جہاد دیتے اور انگریزی حکومت کی جگہ اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کے قیام کی تبلیغ کرتے۔ لوگ جوق جوق بیعت کرتے اور جو لوگ اس بیعت میں شریک نہ ہوتے ان کے گھر بار جلانے کا فیصلہ کرتے چنانچہ بہت سے لوگوں کے گھر

جلادے گئے جو انگریز کی دوستی کی وجہ سے پشاور یا بلوچ علاقہ میں چلے گئے تھے۔ وہاں میں نے یہ دیکھا کہ گانوں کی پنچایت کے فیصلے کی اطاعت حیرت انگیز طریقے پر کی جاتی تھی۔ جب پنچایت یہ فیصلہ کر دیتی تھی کہ فلاں شخص جہاد سے گریز کرتا ہے تو اس کے کسی عزیز یا رشتہ دار کی یہ مجال نہ ہو سکتی تھی کہ اس کی طرف سے جھگڑا کرے یا کوئی عذر معذرت کرے بلکہ خود اس شخص کے اعزا جا کر اس کے گھر کو آگ لگا دیتے تھے۔

ہماری اس تحریک کو جرمن فتوحات کی خبروں نے اور تقویت دی۔ سول اور پانیئر ہمارے پاس روزانہ پہنچتے تھے اور لوگ مرنے لے کر انگریزوں اور ان کے اتحادیوں کی سپاہی کے واقعات پڑھتے اور ان پر سردھنتے تھے بقول اکبر مرحوم

پریس بیور کی خبروں سے پتہ اتنا تو چلتا ہے
فتح انگلش کی ہوتی ہے قدم جرمن کا بڑھتا ہے

سول اور پانیئر کے علاوہ الہلال اور زمیندار بھی شروع شروع میں ہمارے پاس پہنچتے تھے۔ گو وہ کھوڑے عرصے کے بعد بند کر دیے گئے تھے۔ لیکن اس عرصے میں بھی وہ ہمارے لئے خاصی رزق اور گرمی محفل کا سامان بن گئے تھے۔ ان کے مضامین اور تنقیدی شذرے کبھی بھی باسی نہ ہوتے تھے۔ ہم سب کو اس وقت یقین ہو چلا تھا کہ انگریزی نظام جرمن ضربوں کی تاب نہ لا کر دھڑام سے گرنے والا ہے۔ اور انگریزی اخباروں کے تسلی آمیز مضامین کی حقیقت اکبر مرحوم کے الفاظ میں یہی تھی کہ۔

گھر سے آیا ہے یہ خط ہو گیا جہلم ان کا
پانیئر لکھتا ہے ہمارا حال اچھا ہے

اب لوگوں کے دلوں سے انگریز کا رعب اٹھتا جاتا تھا اور جو پہلے متذبذب تھے وہ بھی ہمہ تن ہمارے ساتھ آشریک ہوئے اب ہماری تحریک اپنے پورے

شباب پر تھی اس لئے میں چند دن کے لئے مرکز سے غیر حاضر رہ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے ملا صاحب باہرہ کی دعوت کو قبول کر لیا۔

چمرکنڈ کی وادی جہاں میں نے اپنا مستقر بنایا تھا، نہایت سرسبز وادی تھی۔ چٹنے اور سبزہ زار، ٹھنڈی ہوائیں، لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اسے رشک کشمیر بناتی تھیں۔ لوگوں کی سادہ زندگی تھی اور ان کی مادی ضروریات سب وہاں پیدا ہوتی تھیں۔ چینی، چائے، مصالحہ، دیاسلانی، کپڑا، دوائیں ہندستان سے جاتی تھیں اور ان چیزوں کی باقاعدہ تجارت ہوتی تھی۔ اس وادی سے وہ لوگ شہر، انڈے، مرغیاں، گھی، پاول، گل بنفشہ، نیلوفر، عناب، پستاناں وغیرہ بکثرت ہندستان لاتے تھے اور تبادلہ اجناس سے اچھی خاصی تجارت ہوتی تھی۔ مگر یہ عام تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ قبائلی علاقہ میں ہندو بالکل محفوظ تھا اور اس کی جان، مال، عزت، آبرو، ہر چیز کا سارا قبیلہ ضامن ہونا تھا۔ چمرکنڈ سے ملا صاحب باہرہ کا مستقر شاید کوئی تیس میل ہو گا۔ آمدورفت کے لئے سڑکیں یا شاہراہیں موجود نہ تھیں۔ مگر وہ لوگ اس قدر چھٹی اور جفاکش ہوتے ہیں کہ ایک دن میں تیس چالیس میل پیدل سفر کر لینا ان کے لئے بالکل معمولی بات ہے۔ چنانچہ جب میں چمرکنڈ سے ملا باہرہ کی طرف نکلا تو میری سواری کے لئے ایک نہایت عمدہ گھوڑا تھا۔ اسی طرح ملا بشیر صاحب بھی گھوڑے پر سوار تھے مگر باقی ہمراہی پیدل چل رہے تھے۔ گھوڑا بھی ان پگڈنڈیوں پر قدم قدم ہی چل سکتا ہے۔ اس لئے ہم صبح نماز فجر سے پہلے نکل کر قریباً عصر کے بعد ملا صاحب کے مستقر پہنچ گئے۔ ملا صاحب کا مستقر ایسا پر فضا مقام تھا کہ چمرکنڈ بھی اس کے سامنے گرد تھا۔ میں نے کشمیر، یورپ کے اکثر پہاڑی مقامات اور ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے پہاڑ دیکھے ہیں لیکن ملا صاحب کا مستقر جسے باہرہ کہتے ہیں کسی طرح قدرتی خوبصورتی، سبزہ زار، حسین مناظر اور دلکش چمنوں کی افراط میں ان سے کم نہ تھا۔

میلوں قدرتی چٹھے نہروں کی صورت میں نہ صرف پینے کا شفاف د شیریں پانی مہیا کرتے ہیں بلکہ کھیتوں کو سیراب بھی کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے کناروں پر دو دو دور تک دھان اور مکی کے کھیت آنکھوں کو طراوت اور دلوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی دور تک کھیتیاں ہی کھیتیاں لہلہا رہی تھیں۔ وہاں میں نے ایک عجیب بات دیکھی کہ زمیندار اور کاشتکار کی کوئی تمیز نہ تھی۔ کاشتکار ہی عموماً اپنی کھیتوں کے مالک و مختار ہوتے تھے اور آمد و رفت کے ذرائع کی کمی کے باعث وہ بیرونی تمدن کے تباہ کن اثرات سے بالکل پاک تھے۔ ایسی نچرل زندگی نے ان میں خود داری خیرت اور شجاعت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ لوگ جھوٹ سے نا آشنا تھے۔ گو ان میں ہمارا شہری قسم کا پردہ نہ تھا مگر مخلوط سوسائٹی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ عورتیں حیا کا پتلا نہایت اطمینان سے سفر کرتی ہیں اور خوبصورت سے خوبصورت عورت بھی تمہا بے خطر آتی جاتی ہے اور کسی شخص کی مجال نہیں کہ اُسے چھیرے یا کوئی آوازہ کسے۔ نہیں۔ بلکہ کوئی مرد ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ہم نے بارہا دیکھا کہ سامنے سے ایک نوجوان عورت اکیلی آ رہی ہے۔ مرد راستہ چھوڑ کر الگ ہو گئے اور وہ چپکے سے گزر گئی۔

اس اقتصادی خود مختاری نے وہاں عجیب طرز زندگی کو جنم دیا ہے۔ ان میں نہ تو کوئی پولس ہے، نہ کوئی حاکم، نہ کوئی بادشاہ یا ملک، نہ ٹیکس ہے نہ محصول نہ خراج ہے نہ زور و ظلم۔ وہ نہ خود کسی کی عزت و آبرو، مال و منال پر ہاتھ ڈالتے ہیں نہ وہ اس امر کو برداشت کرتے ہیں کہ کوئی ان کی عزت و آبرو، مال و منال پر ہاتھ ڈالے۔ ان میں ایسے و غریب زمین دار کاشتکار وغیرہ کا کوئی فرق و امتیاز نہیں۔ ان پر صرف ایک حاکم ہے۔ وہ ان کی پنچایت اور پنچایت کا صدر ملا ہوتا ہے وہ شریعت اسلامی کے مطابق حکومت کرتا ہے۔ حکومت کا لفظ بھی شاید صحیح نہ ہوگا۔ ملا صاحب کا اصل کام

یہ ہے کہ وہ اسلامی اجتماعی عدل و مساوات کو قائم رکھیں۔ پولیس کے ڈنڈے کے زور سے نہیں بلکہ لوگوں کے اسلامی محبت کے جذبے سے۔ ان لوگوں میں یہ فطری مادہ ہے کہ جہاں مذہب کا نام آیا وہ خود جھک گئے۔ باپ بیٹے کی پرواہ نہیں کرے گا۔ بھائی بھائی کی رعایت نہیں کرے گا۔ غرض ایک حیرت انگیز معاشرت تھی جو ہر قسم کی طبقاتی کشمکش سے بری تھی۔ تجارت تمام دکمال ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ مگر ان میں اور ہندوستان کے بیویوں میں بھی نمایاں فرق ہے۔

پنچایت وہاں کوئی مستقل ادارہ نہیں ہے جو حکومت کا قائم مقام ہو۔ بلکہ وہ بغیر انتخاب کے خود بخود وجود میں آجاتی ہے۔ ہر بڑا بوڑھا اس کے اجلاس میں آکر بیٹھ جاتا ہے اور نہایت آزادی سے رائے دیتا ہے۔ یہ پنچایت ہمیشہ کسی خاص سانحہ کے وقت وجود میں آتی ہے اور ملا صاحب اس کے صدر کے طور پر تشریف لے آتے ہیں۔ ملا صاحب بھی لوگوں کی داد و دہش کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ ان کی اپنی زمین ہوتی ہے۔ وہ بھی یا تو خود کھیتی باڑی کرتے یا کراتے ہیں۔ ملا صاحب کے پاس عموماً ایک نہ ایک عالم دین ہوتا ہے جو جمعہ و عیدین کا خطبہ، نکاح، نماز، جنازہ وغیرہ کی مذہبی رسومات کی اقتدا کرتا ہے۔ اور وقت ضرورت شریعت کے احکام کی توضیح بھی کر دیتا ہے۔ شریعت کی فرمانبرداری ایسی مطلق ہے کہ جہاں مولوی صاحب نے کوئی فتوے دے دیا وہیں سب کی گردنیں خم ہو گئیں۔ شریعت کی اس اطاعت کو دیکھ کر انارکسٹوں کی "لا حکومت" کی خیالی جنت کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

آدیلم برسر مطلب ہم عصر کے وقت یا اس سے تھوڑی دیر بعد ملا صاحب کے دست پر پہنچے۔ ملا صاحب خود بنفس نہیں استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر گلے لگایا۔ پیار کیا اور خالص افغانی طریق پر میری مزاج پرسی کی۔ وہاں جہان عزیز کے ماتھے پر بوسہ دیا جاتا ہے۔ جسے میں نے "پیار کرنا" سے تعبیر کیا ہے۔ چونکہ

حاجی صاحب ترنگزئی سے ملا صاحب باڑا کا حلقہ اثر زیادہ وسیع تھا اس لئے وہاں بلوک اور خواتین کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ وہ سب میرے استقبال اور جہاد کی تہا بپیر سننے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ ملا صاحب نے میرے اعزاز میں شاندار دعوت کی۔ ایک دنبہ ذبح کیا اور اسے افغان طریق پر سالم پکوا یا گیا۔ مسلم دنبہ کا گوشت نہایت لذیذ اور خستہ ہوتا ہے۔ دنبہ کے علاوہ مسلم مرغ، بھنے ہوئے تیتڑ، دہی، شہد، مکھن اور پنیر وغیرہ بھی تھے۔ نہایت عمدہ تنوری پراٹھے ساتھ تھے۔ رات کو آرام کرنے کے بعد صبح سویرے نماز کے بعد میں ملا صاحب کی وادی کی سیر کے لئے نکلا۔ وادی کیا تھی۔ رشک کشمیر جنت نظیر تھی۔ آب و ہوا وہاں کی ایسی روح پرور اور صحت افزا تھی کہ بقول عربی :-

گر مرغ کباب است کہ بابال و پر آید

چشموں کی کثرت نے اسے مرغزار اور گلزار بنا دیا تھا۔ سردیوں میں وہاں کبھی کبھی برف باری بھی ہوتی ہے۔ مگر کابل کی وادی جیسی شدید نہیں ہوتی۔ گو اوپر پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ موسم بالکل کشمیر کا سا۔ گرمیوں میں بھی سفر کی تکلیف محسوس نہ ہوتی تھی۔

کوئی نوبت کے قریب ملک اور شیوخ جمع ہونے شروع ہوئے۔ ان سب کے سربراہ ملا صاحب باڑہ تھے۔ ملا صاحب سفید ریش بزرگ تھے۔ میرے خیال میں اس وقت ان کی عمر ستر سال سے متجاوز ہوگی۔ مگر صحت نہایت عمدہ بغیر عینک کے قرآن شریف پڑھتے تھے اور ایسے تیز رو کہ جو ان بھی مشکل سے ساتھ دے سکیں۔ پہلے پتلے جسم کے دراز قامت اور چہرے سے نور ایمانی اور فہم و فراست عیاں تھے۔ بات چیت میں نہایت سنجیدہ۔ پہلے میں نے اپنا سارا پروگرام ان کی خدمت میں پیش کیا۔ کہنے لگے امیر حبیب اللہ سے ہمیں اُمید فلاح نہیں۔ کیونکہ جس شخص نے انگریزوں

سے روپیہ لے کر آپ کو کابل سے نکال دیا اس سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ یہاں
 ہماری کرے گا۔ میں کچھ لاجواب سا ہو گیا۔ لیکن میں نے کہا کہ ہماری سیکم کی
 باگ دوڑ دراصل نصر اللہ خاں (امیر حبیب اللہ کے برادر اصغر) کے ہاتھ میں ہے۔
 اور گو نام امیر حبیب اللہ کا لیا جاتا ہے لیکن روح رواں نصر اللہ خاں ہی ہیں۔ اس
 پر وہ خاموش ہو گئے اور کہا اچھا میں تیار ہوں۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور میرا
 جی چاہتا ہے کہ میرا اسلام کے کام آئے اور میں شہادت کی موت مر کر خدا کے
 حضور میں سرخرو جاؤں۔ ان کے سادہ الفاظ میں کچھ ایسا جوش تھا کہ دل سے نکلتے
 تھے اور دل ہی میں جا کر بیوست ہوتے تھے۔ پھر جلسہ شروع ہوا تو پہلے ملا صاحب
 نے پشتو میں میرا تعارف کر دیا اور اس میں یہاں تک فرمایا کہ مولوی محمد علی مجھے اپنے
 بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ جو کوئی مجھے خوش کرنا چاہتا ہے وہ مولوی صاحب کے
 ساتھ تعاون کرے۔ یہ کافر فرنگی کے خلاف جہاد کی تحریک لے کر آئے ہیں۔ یہ سیدھا
 جنت کا رستہ ہے۔ مر گئے تو شہید اور جیت گئے تو غازی۔ ہندوستان ہمارا ہے اور ہم
 اسے دوبارہ کفار کی غلامی سے نجات دلا کر مسلمانوں کے زیر نگیں لائیں گے انشا اللہ تعالیٰ۔
 اس کے بعد میری تقریر شروع ہوئی۔ مولوی فضل ربی نے ترجمانی کے فرائض
 انجام دیے۔ یہ مہند قوم سے تھے اور کئی سال دیوبند رہ کر وہاں سے دستارِ فضیلت
 حاصل کر کے واپس اپنے وطن آکر ملا صاحب باہرہ کے ساتھ منسلک ہو گئے تھے۔ میری
 تقریر کوئی دو گھنٹہ تک جاری رہی اور چونکہ اسے میں نے بار بار اپنے قیام کے
 دوران میں دہرایا اس لئے اس کا خلاصہ حافظہ میں محفوظ ہے۔ میں نے ان
 مسلمانوں کو دنیا کی سیاست میں ان کا صحیح مقام بتایا اور کہا کہ دنیا اپنے رہبر کی
 گمشدگی سے پریشان ہے۔ دنیا کے تمام دکھوں کا واحد علاج یہ ہے کہ اسے پھر
 اسلام کے پیغام سے روشناس کیا جائے اور اس کے لئے اول قدم یہ ہے کہ ہم

انگریزوں سے ہندوستان واپس چھینیں کیونکہ انہوں نے دھوکہ اور فریب سے ہم
مسلمانوں کو بے دخل کیا تھا۔ ہندوستان میں دوبارہ اسلامی حکومت قائم کر کے
وہاں تبلیغ و اشاعت کا ایک منظم سلسلہ قائم کیا جائے۔ پہلے تو وہاں کے آٹھ کروڑ
اچھوتوں کو حلقہ بگوش اسلام بنائیں، پھر وہاں کی ساری آبادی ہندو سکھ، عیسائی
کو اسلام کی صحیح تعلیم سکھائیں اور دنیا کو مسلمان بنانے کی مہم شروع کریں۔ مغرب
کی مادہ پرستی نے انسانوں کو خونخوار بھٹیڑوں سے بھی زیادہ خونخوار بنا دیا ہے اور وہ
اپنے اغراض مشورہ کو پورا کرنے کے لئے قوموں کے خون سے ہولی کھیلتے ہیں۔ اس
کا واحد علاج یہ ہے کہ دنیا کو مادیت کے چنگل سے چھڑا کر اسلامی اخلاق اور اسلامی
عداقت سے روشناس کیا جائے۔

تقریر کچھ اس قدر جوشیلی تھی اور میرے دل میں مغرب کی مادہ پرستی اور اسلام
دشمنی کے خلاف اس قدر سخت جذبات مشتعل تھے کہ میں جو کچھ بھی ان کے خلاف کہتا
کم تھا۔ تقریر کے خاتمے پر مجھے اب تک یاد ہے کہ سارا مجمع جوش میں کھڑا ہو گیا۔ لوگ
جوش سے کہنے لگے کہ لاؤ ہاتھ دو ہم تمہارے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کرتے ہیں اور وعدہ
کرتے ہیں کہ جب تک ہم میں سے ایک آدمی بھی زندہ ہے ہم انگریزوں کے خلاف تلوار
کو نیام میں نہیں کریں گے۔ اس پر میں نے ان کا دلی شکر یہ ادا کیا اور کہا کہ تم لوگوں کی
خوش قسمتی ہے کہ ملا صاحب باہڑہ جیسی ہستی تم میں موجود ہیں۔ پھر میں نے تجویز کیا کہ ملا
صاحب باہڑہ، حاجی صاحب ترنگزنی اور دوسرے ملا صاحب کو دعوت دیں تاکہ یہاں
مشورے سے حملہ کی سکیم طے کی جاسکے۔ چنانچہ ملا صاحب نے سب سے پہلے حاجی
صاحب کو دعوت دی۔ چونکہ میں انہیں تیار کر گیا تھا۔ اس لئے انہوں نے فوراً دعوت
قبول کر لی۔ ان کے آنے پر ملا صاحب، حاجی صاحب، ملا بشیر صاحب اور میں دیر تک
مشاورت کرتے رہے۔ تجویز ہوئی کہ ملا بشیر صاحب ہم سب کی طرف سے یاغستان کا دورہ

کریں اور امیر عبد الجبار والی صوات، امیر نعمت اللہ امیر مجاہدین، سڈا کے ملا صاحب، مہتر چترال اور نواب امب وغیرہ سے مل کر ان سب کا تعاون حاصل کریں۔ اور یہ فیصلہ کریں کہ ان میں سے ہر ایک انگریز کے خلاف کس کس محاذ پر لشکر کشی کرے گا۔ اس کے بعد ملا صاحب باہڑہ اور حاجی صاحب ترنگزائی چمرکنڈ میں جمع ہو کر ان تمام معاہدوں کا جائزہ لیں اور ایک ہمہ گیر منصوبہ مرتب کر کے امیر صیب اللہ کو دعوتِ جہاد دیں۔

حدیث درود لا ویزدا ستانے بہت

کہ ذوقِ بیٹھ دہ چوں دراز تر گر دو

اب ہماری تحریک انقلاب اپنے پورے شباب پر تھی۔ یاغستان میں سوائے ہماری تیاریوں اور تقریروں کے اور کوئی چہ چاہی نہ تھا۔ مسجدوں میں ہماری کامیابی کے لئے دعائیں کی جاتی تھیں۔ اس لئے جب ملا بشیر صاحب نے قرار داد کے مطابق دورہ شروع کیا تو انگریزوں نے بھی اس کے خلاف باقاعدہ مہم جاری کر دی۔ سب سے پہلے تو انھوں نے مختلف سرحدی مقامات پر جہاں حملوں کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ خاردار تارنگا کران میں بجلی کی رو دوڑادی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کوئی شخص اس نار کے قریب بھی جاتا تو وہ صدمہ سے مر جاتا۔ چنانچہ شروع شروع میں کئی موتیں واقع ہو گئیں اور لوگوں میں ایک عام دہشت پھیل گئی۔ دوسری طرف انھوں نے امیر عبد الجبار والی صوات، نواب امب، مہتر صاحب چترال وغیرہم کے پاس اپنے خاص قاصد روانہ کئے کہ خبردار تم ملا بشیر یا اس کی پارٹی کے کسی رکن سے کسی قسم کا تعلق قائم مت کرنا ورنہ تمہارے خلاف نہایت سخت کارروائی کی جائے گی۔ میرے خلاف امیر صیب اللہ خاں کو سخت انتباہ کیا کہ ہمارے باغیوں سے تم کسی قسم کا تعلق قائم مت رکھو ورنہ کابل کی سالانہ گرانٹ چوبیس لاکھ کی ضبط کر لی جائے گی۔ امیر

صاحب کو ہماری مدد سے بھی روکا گیا۔ ادھر ہمارے خلاف وارنٹ جاری کئے گئے کہ ہماری پارٹی کا جو شخص بھی گرفتار ہو اس پر بغاوت کا مقدمہ چلا کر پچانسی کی سزا دی جائے۔ لیکن خدا کی ہر بانی سے ہماری تحریک خوب پھیل چکی تھی اور اس نے یہاں تک اثر و نفوذ پیدا کر لیا تھا کہ بڑے بڑے خواتین اور ملا اس کی علانیہ مخالفت کرنے سے ڈرنے لگے تھے۔

چنانچہ سب سے پہلے تو میں نے خود (Insulated Scissors) (= حاجر قیچی) بنائی اور اس سے بجلی کے تاروں کو جگہ جگہ سے کاٹ کر حملوں کے لئے راست نکالا۔ اس ایک واقعے نے ہمارا وقار دو چند کر دیا اور لوگ میری طرف فوق الفطرت قوتوں کو منسوب کرنے لگے۔ ادھر ملا بشیر صاحب کا دورہ شروع ہوا۔ اس میں خلاف توقع کامیابی ہوئی اور جس جگہ وہ پہنچے ان کا نہایت شاندار استقبال ہوا اور "یدِ خلون فی دین اللہ افواجاً" کا نظارہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ نواب امب امیر عبدالجبار اور مہتر چترال وغیر ہم حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے تھے اور اس وقت وہ بھی ہمارے ہمنوائے تھے کہ انگریز کا چراغ ٹٹما رہا ہے۔ کوئی دن میں گل ہوا چاہتا ہے۔ اس لئے انگریز کی دہمکیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے خفیہ طور پر ملا بشیر صاحب سے ملاقاتیں کیں اور یقین دلایا کہ جو نہی امیر حبیب اللہ ہندوستان پر حملہ کریں گے ہم فوراً اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ ہلہ بول دیں گے۔ گو ان لوگوں کی جمعیت چند سپاہیوں سے زیادہ نہ تھی مگر ان کے علاقوں میں اکثر لوگ بندوق چلانا اور گوریلا لڑائی لڑنا خوب جانتے تھے۔ ہتھیار تیار کرنے کا ہم نے ذمہ لیا بلکہ اکثر قبائلی سردار ہمارے یہاں آگئے اور ایک عام حملے کی تیاری میں شریک ہو گئے۔

ملا بشیر صاحب بھی ایک بے نظیر انسان تھے مجسم عمل۔ خلوص کا پتلا ادھر انگریز کے خلاف پرو پاگند کرنے میں بڑے مشاق۔ مقرر ایسے اعلیٰ درجہ کے بڑے بڑے مجمعے

ان کی آتش بیانی سے مسحور ہو جاتے تھے۔ جب وہ واپس لوٹے تو ملا صاحب باہرہ اور حاجی صاحب چمرکنڈ تشریف لائے۔ میں نے ان کے قیام و طعام کا پرنکٹف انتظام کیا۔ نشست کے لئے چاروں طرف پلنگ اور ان پر نہایت پرنکٹف بستر بچھائے گئے اور درمیان میں فرش عام آدمیوں کے لئے۔ قاعدہ یہ تھا کہ جہاں تو پلنگوں پر بیٹھتے تھے اور میزبان فرش پر لیکن جناب ملا صاحب آتے ہی فرش پر بیٹھ گئے۔ ملا بستر صاحب نے اپنے دورہ کی مکمل روداد پیش کی۔ ان کی اطلاعات بہت امید افزا تھیں۔ اس پر فیصلہ ہوا کہ میں بھی ایک مختصر سا دورہ کروں اور بطور امتحان کے ایک حملہ انگریزوں کے علاقہ پر کر کے دیکھا جائے کہ لوگ کس حد تک تعاون کر سکتے ہیں تاکہ امیر حبیب اللہ خاں کو ہم کسی قسم کا غلط وعدہ نہ دیں۔

اس دورے میں جن مقامات پر جانا ہوا وہاں کے لوگ اس قدر قوی ہو چکے اور خوبصورت جوان تھے کہ ان کی صحت پر رشک آتا تھا۔ ان لوگوں کے خلوص ان کی شجاعت ان کا ایثار، اسلام سے ان کی شیفتگی نہایت قابل رشک تھی۔ میں اب بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ایسا زبردست انقلابی لشکر کسی لیڈر کو میسر نہ آسکتا تھا۔ اور اگر امیر حبیب اللہ (جیسا کہ میں آئندہ چل کر بیان کروں گا) انگریزوں سے مرعوب ہو کر بڑولی نہ دکھاتے تو نہ صرف ہندوستان کی بلکہ شاید عالم اسلام کی تاریخ ہی اور طرح سے لکھی جاتی۔ حالات ایسے مساعد تھے کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام کچھ دشوار نہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ انگریزوں کی اس وقت تباہی اور ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام ایسے امور تھے جو تاریخ کا دھارا بدل دیتے۔

یہاں اسنظر ادا۔ اس علاقے کی ارزانی کا ذکر بھی سن لیجئے؛ بہترین گھی روپیہ کا چار سیر بچیتہ۔ شہد خالص بھی روپیہ کا چار سیر۔ عمدہ مرغی روپے کی آٹھ بٹیریں روپے کی سولہ۔ تینتر، چکور روپے کی آٹھ دس۔ انڈوں کی ارزانی تو بیان سے باہر تھی۔

نہایت عمدہ اصل بھینس کا دودھ ایک آنہ سیر۔ جو کبھی ایک من کبھی سوا من فی روپہ۔ چاول موٹی قسم کے بیس پچیس سیر فی روپہ۔ گیہوں دو روپے فی من اور کبھی ڈیڑھ روپے فی من۔ لیکن زراعت کے طریقے قدیم چاہی آب پاشی قریباً مفقود تھی۔ بس قدرتی چشمتے خود بخود نہروں کی صورت میں مختلف کھیتوں سے گزرتے تھے اس علاقہ میں ایک خطہ ہے جہاں مہونہ قبیلہ بستہ ہے۔ ایسا زرخیز خوبصورت دلکش خطہ بہت کم پایا جاتا ہے اگر اسے سیرگاہ بنایا جائے تو کشمیر اور اوٹاکنڈ کی بہترین سیرگاہوں کی برابری کر سکتا ہے۔ لوگ نہایت سادہ مہمان نواز، غیور، بہادر اور سمجھدار ہیں۔ جہاں نوازی کا تو یہ عالم ہے کہ آپ کسی گاؤں میں چلے جائیے تو آپ وہاں کے مہمان ہوں گے اور جتنے دن بھی آپ وہاں قیام کریں آپ اپنا کھانا نہیں کھا سکتے۔ جب میں وہاں پہنچا تو ہر چند کہ میرے ساتھ اچھا خاصہ شکر تھا مگر اس قدر تپاک سے ان لوگوں نے میرا خیر مقدم کیا اور ایسی پرکھت مہمانی کی کہ میں آج تک اسے نہیں بھول سکتا۔

قصہ مختصر میرا دورہ توقع سے بڑھ کر کامیاب ہوا۔ اور لوگوں کا شوقی جہاد، ان کا ایثار اور ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے ان کا عزم بالجزم قابل داد تھے۔ اور میں جب واپس لوٹا تو اس عزم سے معمور تھا کہ اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا مشن ضرور کامیاب ہوگا۔ اور ہم انگریزوں کو نکال کر ہندوستان میں اسلامی حکومت پھر سے قائم کریں گے انگریزوں نے ہر چند خفیہ ايجنٹ میرے قتل کرنے اور اس تحریک کو ناکام بنانے کے لئے بھیجے مگر انھیں ناکامی ہوئی۔

چمکنڈ واپس لوٹ کر ایک مجلس مشاورت منعقد ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ملا بشیر صاحب تو امیر حبیب اللہ خاں کی خدمت میں جائیں اور تمام احوال عرض کر کے ان کا تعاون اور سرپرستی حاصل کریں۔ ادھر ازبک، پاراچنار، کوہاٹ، درہ، نخل، پشاور تمام علاقہ پر بیک وقت لشکر کشی ہو۔ ادھر امیر حبیب اللہ خاں سے قندھار پر اور

ڈکے کے راستے کو ہاٹ، تھل اور لنڈی کوتل پر حملہ کر دیں۔ ان کے حملے کے بعد نواب
 امب، ہنتر چترال اور بادشاہ صاحب صوات وغیرہ اعلان جہاد کر دیں۔ امیر حبیب اللہ
 کے ذمہ تمام قبائلی لشکر کو اسلحہ اور روپیہ سے مدد کرنا بھی تھا اور اس کا حتمی وعدہ وہ
 ملا بشیر کی وساطت سے کر چکے تھے۔ ملا بشیر کو کابل روانہ کرنے کے بعد ہم نے بطور مشق
 کے انگریز پر ایک حملہ کیا۔ اس میں میں اور حاجی صاحب ترنگزی گنڈاب، شبقدر اور
 مچنی کے محاذ پر حملہ آور ہوئے۔ ملا صاحب ہاڑہ اپنے محاذ پر ہمارے ساتھ کوئی تیس
 ہزار کا لشکر ہوگا۔ اسے مختلف ٹویوں میں بانٹ کر ہم نے تمام درے پر قبضہ کر لیا اور
 انگریز کی پیش قدمی کی تمام راہیں روک دیں۔ ایک اگلے مورچہ پر میں خود ایک سو بیس
 مجاہدین کے تھا۔ ہم سے کوئی دو سو گز پر پر انگریزی گورہ فوج خندقیں کھود کر مورچوں
 میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے عقب میں شبقدر کا مشہور قلعہ تھا، گیارہ ہوائی جہاز ہمارے
 مورچوں پر پرواز کر کے لشکریوں کی نشان دہی کر رہے تھے تاکہ قلعہ کی آتش ہارتوں
 ہمارے مورچوں پر گولہ اندازی کریں۔ اس زمانے میں ہوائی جہاز خود بمباری
 نہ کر سکتے تھے۔ صرف نشان دہی کا کام کرتے تھے۔ قلعہ سے ۷۲ توپیں بیک وقت
 صرف ہمارے مورچہ پر گولے پھینکتی تھیں۔ ہمارا مورچہ ایک مضبوط پہاڑی پر
 نہایت محفوظ مقام پر تھا اور انگریزی توپوں کے گولے اس کے اندر نہیں آسکتے
 تھے۔ لیکن عقب میں بیک وقت آکر گرتے اور اس زور سے پھٹتے تھے کہ دل دہل
 جاتے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ مشین گنوں کی بارش۔ گولوں کے بیک وقت پھٹنے سے
 پہاڑی کے پتھر ٹوٹ ٹوٹ کر ہوا میں اڑتے تھے اور تکون الجبال کا لہن المنفوش
 کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ ہمارے مورچہ میں گیارہ آدمی شہید ہو گئے۔ تین دن اور تین
 رات مسلسل گولہ باری ہوتی رہی اور ہم بھی برابر جواب دیتے رہے۔ مجھے اچھی طرح سے
 یاد ہے کہ ان بہتر گھنٹوں میں نہ ہم نے کھانا کھایا اور نہ پانی کے سوا اور کوئی چیز

ہمارے حلق سے نیچے اتری۔ لیکن جوشِ جہاد کا یہ عالم تھا کہ نہ تو ہم میں سے کسی کو
 نیند نے ستایا نہ تھکان محسوس ہوئی۔ آخر تین شبانہ روز کی لڑائی کے بعد انگریزی
 فوجیں شہزاد کے قلعے میں پسپا ہوئیں اور ہمارے تمام لشکری خندقوں پر پل پڑے
 تاکہ مال غنیمت لوٹیں۔ چنانچہ سینکڑوں ہندو قہیں اور لاکھوں کارتوس ہمارے
 قبضے میں آئے۔

جو نہی لڑائی فتح ہوئی میں نے دیکھا کہ دیہاتوں سے عورتیں بجاتی ہوئی گیت
 گاتی ہوئی ہمارے مورچوں میں گھس آئیں۔ مجھے وہ نظارہ اب تک نہیں بھولتا اور
 میں اکثر سوچتا ہوں کہ جس قوم کی عورتیں ایسی بہادر اور شیردل ہوں وہ جو کچھ بھی کرے
 کم ہے۔ عورتوں نے اگر لاشوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا کہ کوئی شخص بیٹے پر
 گولی کھا کر تو نہیں مرا؟ کیونکہ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ بھاگتے وقت مارا گیا۔
 جب انہوں نے دیکھا کہ خدائی مہربانی سے سبھی مقتول سینوں میں گولیاں کھا کر شہید
 ہوئے ہیں تو ماں اپنے شہید بیٹے کا منہ چومنے لگی، بہن اپنے شہید بھائی کو پیار کرتے
 لگی، بیوی اپنے شہید شوہر کو گلے لگانے لگی اور پشتوں کے گیت گانے لگیں جن کا مطلب
 یہ تھا کہ ”جاؤ تم کو خدا کے سپرد کیا۔ تم شہید ہو۔ اب جنت کی سیریں کرو۔ مگر خدا کے
 لئے ہمیں نہ بھول جانا۔ خدا سے دعا مانگو کہ ہم بھی اس کی راہ میں کام آئیں اور تمہارے
 بھائیوں کو بھی توفیق ہو کہ وہ تمہارے نقش قدم پر چلیں۔“ پھر شہدائی لاشوں کو اٹھا کر
 خوشی سے اچھلتی اور گاتی ہوئی گاؤں کو واپس لوٹیں اور ان کو انہی کے کپڑوں میں بغیر
 غسل دیے دفن کر دیا گیا۔

وہاں سے واپسی کا وقت اب تک مجھے یاد ہے جیسے کل کی بات ہو میں اور
 اور تمام لشکری نیند اور بھوک سے بے تاب تھے۔ میرا یہ حال تھا کہ چلتے چلتے اونگھ
 رہا تھا۔ کوئی تین میل پیدل چلنے کے بعد گاؤں آ گیا۔ عورتیں اور بچے اور بڑے

اور بوڑھے ہمارے استقبال کے لئے کل آئے۔ اور ہر طرف سے مبارک سلامت کے دو ٹکڑے برسے لگے۔ فوراً کھانا چنا گیا۔ کھانے میں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مٹکا کی روٹی اور ٹٹی تھی۔ مٹکا کی روٹی گھی میں گندھی ہوئی تھی۔ میں نے تمام عمر میں اس سے لذیذ تر کھانا نہیں کھایا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بھوک کی شدت نے منے کو دو بالا کر دیا تھا۔ اس جہار نے میری عزت المضاعف کر دی۔ بلکہ غلیو نے یہاں تک رنگ آمیزی کی کہ لوگ کہنے لگے کہ گولی مجھ پر اثر نہیں کرتی اور مجھے ایسے جنت منتر آتے ہیں کہ انگریزی توپوں کا منہ بند کر سکتا ہوں، جس قدر میں نزدیک کرتا تھا لوگوں کو اسی قدر پختہ یقین ہوتا جاتا تھا کہ میں ازراہ کس نفسی ایسا کر رہا ہوں۔ اس کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ میں جس گاؤں میں سے گزرتا تھا وہاں کے مریض سب کے سب دم کروانے کے لئے میرے گرد جمع ہو جاتے۔ چنانچہ ان کی دل داری کے لئے مجھے ان سب پر قرآنی آیتیں پڑھ کر پھونکنا پڑیں۔

جب ہم چمرکنڈ پہنچے تو سول اور پانیر منگوا کر اپنی پہلی یورس کی سرکاری کیفیت پڑھے کا اتفاق ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں کیمبرج میں تھا تو لارڈ ہارے نے ایک میچر دیا تھا جس کا عنوان تھا "تاریخ میں راست گفتاری کی نوعیت" اس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ "موجودہ تہذیب و تمدن کا سب سے بڑا شکار راست بازی اور صداقت ہے۔ یعنی ہماری تاریخ، ہماری تہذیب سب اکاذیب و اباطیل سے آراستہ کی جاتی ہے۔ چنانچہ سول اور پانیر کی افیشل اطلاعات کو پڑھ کر مجھے مہنی بھی آئی اور یقین بھی ہو گیا کہ انگریزی مورخین یا نامہ نگاروں سے حق کی توقع رکھنا بالکل عبث ہے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ کذب اور دروغ بیانی ممکن نہ تھی۔ شاید موجودہ جنگوں میں محتازین اسی طرح رپورٹیں اپنے اپنے اخبارات کو دیتے ہوں گے۔

ہم نے صحیح واقعات کی مفصل روئداد ملا بشیر صاحب کو دے کر کابل روانہ کیا۔

نائب السلطنت جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں انگریزوں کے نہایت سخت دشمن تھے۔ اس لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ انگریزوں کی ہزیمت کی خبر سے خوش نہ ہوتے۔ انہوں نے اس وقت سے ہندوستان کی فتح کے خواب دیکھنا شروع کئے لیکن امیر جدید اللہ خاں پر اس کا اثر اٹا پڑا۔ انہوں نے نائب السلطنت سے کہا کہ میں ملا بشیر سے علاوہ نہیں مل سکتا۔ نائب السلطنت کے اصرار پر کہا کہ اچھا رات کو ہمارے خواب گاہ میں ملا بشیر کو حاضر کرو۔ کوئی رات کے شاید بارہ بجے نائب السلطنت صاحب ملا بشیر کو لے کر قصر دلکشا کے نہایت آراستہ کمرے میں حاضر ہوئے۔ امیر صاحب نے رسمی طور پر مزاج پرسی کی اور حالات سے۔ لیکن ان کا وہ جوش و خروش بالکل غائب ہو چکا تھا۔ ملا بشیر بے چارے پر بھی اوس سی پڑ گئی۔ خیر واپس آکر وہ نائب السلطنت کے ہاں مقیم ہوئے۔ نصر اللہ خاں بھی ملا بشیر کی مایوسی کو بھانپ گئے اور مختلف تاویلوں سے امیر صاحب کی بے رخی کے اثر کو مٹانے کی کوشش کی۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ اعلیٰ حضرت کو ہر فریق کو خوش کرنا پڑتا ہے۔ انگریزوں کو چونکہ یورپ میں شکستیں ہو رہی اور مستقبل تیرہ و تار نظر آ رہا ہے اس لئے امیر صاحب نہیں چاہتے کہ انہیں خفگی کا موقع دیں کہ کہیں کھسیانی بی کھنبا لوچے کے مصداق وہ کابل ہی چڑھائی نہ کر دیں۔ پھر انہوں نے بتایا کہ انگریزوں نے امیر صاحب کو ایک بہت سخت مراسلہ بھیجا ہے کہ خبردار تم باغیوں سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھنا اور اس کے ساتھ ہی ان کی مٹھی گرم کرنے کا وعدہ بھی تھا۔ نائب السلطنت صاحب نے رخصت کے وقت ملا بشیر کو شاید بارہ یا پندرہ ہزار روپیہ نقد اور کچھ اسلحہ دیے کہ انہیں قبائلی سرداروں میں تقسیم کر دیں۔

یہ مستبد بادشاہ بھی عجیب قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ بلکہ شاید انہیں انسان

کہنا انسانیت کی توہین ہو۔ نہایت سخت خود غرض بے رحم عیار و مکار شخص سے خائف اور اپنے خیر خواہ ترین اعزاء و اقربا سے بھی بدظن۔ ان کے پیش نظر صرف اپنے اقدار اور اپنے تعین کے سامان کو محفوظ رکھنے کے سوا کوئی اور مقصد نہیں ہوتا۔ ان سے یہ توقع رکھنا کہ "کسی انقلابی تحریک کی رہ نمائی کریں گے حماقت اور خود نریبی ہے۔ مگر افسوس کہ ہم اس وقت تک اسی خود فریبی میں مبتلا تھے کہ امیر حبیب اللہ درحقیقت ہمارے ساتھ ہیں اور انگریزوں کو محض چکمہ دے رہے ہیں۔ حالانکہ وہ فریقین کو چکمہ دے رہے تھے۔ لیکن ہماری آخری ٹنگر نے انھیں چوکنا کر دیا۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ ملا بشیر کے کابل سے رخصت ہونے کے بعد امیر صاحب نے اپنے اعیان و اعزاکے ایک نہایت راز کی کونسل منعقد کی جس میں نصر اللہ خاں، امان اللہ خاں، نادر شاہ اور ان کے بھائی، علیا حضرت (امیر صاحب کی محبوب ترین ملکہ اور امان اللہ خاں کی والدہ) شریک تھے۔ اس میں انھوں نے اس حدیث کا اظہار کیا کہ یہ تحریک اب صحیح معنوں میں انقلابی ہوتی جا رہی ہے اور ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ افغانستان کو بھی اپنی پیٹ میں نہ لے لے اور یہاں بھی ایک جمہوری حکومت کے قیام کی شوریں نہ شروع ہو جائے جس کا انجام یہ ہو کہ بہادر خاندان ختم ہو جائے اور کوئی اور فریق برسر اقدار آجائے۔ اس جلسے میں صرف نصر اللہ خاں اور علیا حضرت نے ہماری تائید کی اور کہا کہ اگر انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کیلئے ہمیں اپنا تاج و تخت بھی قربان کرنا پڑے تو اس کی پرواہ نہیں۔ صحیح۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

علیا حضرت نے کچھ اس قدر سخت لہجہ میں کلام کیا کہ اعلیٰ حضرت ناراض ہو گئے اور انھیں باغ بالا میں خانہ نشین یا نظر بند کر دیا۔

ملا بشیر واپس ہوئے۔ ہم نے دیکھا کہ امیر حبیب اللہ کی طرف سے اب

سرد مہری کا برتاؤ شروع ہو گیا۔ مثلاً جرمن کمیشن کے ممبروں کو کابل سے رخصت کر دیا گیا۔ ہمارے لیے ہتھیاروں کی فراہمی سخت مشکل ہو گئی۔ پہلے ہمارے ایجنٹ چمرکنڈ سے کابل اور کابل سے افغان راہداری (پاسپورٹ) لے کر بے خوف و خطر ہندوستان آتے جاتے تھے، جہاد کے لیے روپیہ فراہم کرتے تھے اور اس راستے سے واپس ہمارے پاس پہنچ جاتے تھے۔ مگر اب امیر صاحب نے اس کام میں بھی رکاوٹیں ڈالنی شروع کیں۔ ادھر یا غنجان میں ہمارا کام زوروں پر تھا اور لوگوں کا جوش مضاعف ہو رہا تھا اور لوگ کہتے تھے کہ امیر افغانستان کیوں ہندوستان پر حملہ نہیں کرتا۔

یہ مسئلہ کہ انقلابی تحریکیں لیڈر پیدا کرتی ہیں یا لیڈر اپنی ہوشیاری، تدبیر اور قربانی و ایثار سے انقلابی تحریکیں کو چلاتے یا کامیاب بناتے ہیں، مرغی اور انڈے کی پیدائش کے مسئلے کی طرح لاینحل ہے۔ مگر ہم نے تو آزما کر دیکھا کہ اکثر تحریکیں لیڈروں کی ناقصیت اندیشی یا بزدلی سے ناکام ہو گئیں۔ ہندوستان میں ہم نے مسلمانوں کی مذہبی تنظیم کی تحریک اٹھائی مگر اس میں بھی غلطی یہ کہ مولانا ابوالکلام کو امام الہند بنا کر تمام تحریک ان کے بل بوتے پر کھڑی کی لیکن عین وقت پر مولانا آزاد کی بزدلی نے تمام کھیل بگاڑ دیا اور وہ سارے کا سارا محل جس کی تعمیر پر لاکھوں روپیہ صرف ہوا تھا اور سینکڑوں مسلمانوں نے اسے اپنے خون سے سینچا مولانا کی گریہ پائی کی وجہ سے ان کی آن میں دھڑام سے نیچے آن گرا۔ اسی طرح سلطان ابن سعود کی تحریک الاخوان جس کے متعلق اچھے اچھے مبصروں کا خیال تھا کہ عرب کی کاپلٹ دے گی، وہاں لیڈروں کی نالائقی اور کوتاہ اندیشی کا شکار ہو گئی۔ یہی حال ہماری تحریک کا ہوا۔ ہماری تحریک ایک نہایت زبردست انقلابی تحریک تھی، مگر اس کا محور امیر حبیب اللہ کی ذات تھی اور اپنے حسن ظن یا ناجرہ کاری کی بنیاد نہ سوچا کہ میر حبیب اللہ اپنی فطرت کو کیوں ترک کر سکتا

ہے اور ایک شخص جس کا ضمیر ہی غیر اسلامی ہو کیونکہ اسلام کا موید و حامی بن سکتا ہے
 قصہ مختصر ہم تو امیر حبیب اللہ کا پر و پگند اکر رہے تھے اور وہ ہم سے زیادہ سے زیادہ
 بدظن ہوا جا رہا تھا۔ شاید اس کو یقین ہو گیا تھا کہ ہم کامیاب ہونے کی صورت میں
 خود اس کا سر کھل دیں گے اور ایک صحیح جمہوری یعنی اسلامی حکومت قائم کریں گے اور
 اس کی استبدادیت کا خاتمہ کر دیں گے۔ اس لئے وہ طرح طرح سے اب ہمیں ناکام
 بنانے کے ورپے ہو رہا تھا۔ اس کی طرف سے اب ہمارے کام کی راہ میں مختلف
 رکاوٹیں پیدا کی جانے لگیں۔ مگر ہم اصلی حالات سے اس وقت تک بے خبر تھے اور
 کچھ اپنے جوش جنوں میں ان سب حرکتوں کی توجیہ کر کے اپنے دل کو تسلی دے لیتے
 تھے کہ یہ باتیں انگریزوں کے ڈر کی وجہ سے ہیں! اور جب حملہ کا وقت آئے گا تو سب
 ٹھیک ہو جائے گا، پھر بھی ہم امیر حبیب اللہ خاں کے رویہ سے بد دل ضرور
 ہو گئے تھے اور ہم نے اب ارادہ کیا کہ ہم کوئی اور راستہ اختیار کریں۔ ایک تو یہ
 تھا کہ خود افغانستان میں انقلاب کر دیا جائے اور امیر حبیب اللہ خاں کی جگہ
 سردار نصر اللہ خاں کو افغانستان کا بادشاہ بنا دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان
 سے کوئی صاحب اثر لیڈر بلا کر یا غمستان میں اسے امام بنا دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ
 امیر المجاہدین امیر نعمت اللہ کو اس تحریک کا لیڈر بنا دیا جائے۔ لیکن حالات کی
 نزاکت ہمیں فوری اور عاجلانہ اقدام سے روکتی تھی۔ اب صورت حالات یہ تھی
 کہ ہم نے خود تحریر سے تقریر سے پبلک جلسوں اور اشتہاروں کے ذریعہ امیر
 حبیب اللہ کو مسلمانوں کے نجات دہندہ کے طور پر قبائلیوں کے سامنے پیش کیا
 تھا اور اب یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ ہم خود ہی اس کو خائن دغا دار کہنا شروع کر دیں۔
 قبائلی بالکل اُن پڑھ لوگ تھے اور اُن پڑھ آدمی کا یہ قاعدہ ہے کہ اسے جب بھی کسی
 بات پر ایمان ہو جاتا ہے وہ حد سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ وہ پھر نفسیاتی طور پر

اس شخص کے خلاف کوئی بات سننی گوارا نہیں کر سکتا۔ پیری کی کامیابی کا یہی راز ہے۔
 غرض ہم اگر فوری طور پر امیر صاحب کے خلاف کوئی لفظ نکالتے تو ان لوگوں کی
 نظروں میں خود مجرم قرار پاتے۔ اس لئے پہلے ہم نے اپنے خاص آدمیوں کی مجلس شوریٰ
 منعقد کی۔ اس میں کئی نہایت سرگرم کارکن شریک تھے۔ بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ
 ہوا کہ چمرکنڈ کے اسکول اور ٹریننگ سنٹر کو فی الحال بند کر کے میں دوبارہ یاغستان
 کا دورہ کروں اور ملوک و خوانین سے براہ راست مل کر تحریک کو دوسرے راستے
 پر ڈالنے کی کوشش کی جائے۔

مستقل کام کے لئے بہت زبردست منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ
 ایک مفصل اسکیم تیار کی گئی جس میں دو باتیں نہایت اہم تھیں۔ ایک تو یہ کہ قبائلیوں
 کو تعلیم سے روشناس کر کے انہیں ضبط و نظم کے تحت لایا جائے تاکہ وہ بذاتِ خود
 ایک لشکر بن سکیں اور ان کے جوہر جو صرف لوٹ مار میں ضائع ہو رہے تھے کسی
 کام آسکیں۔ دوسرے ان کی اقتصادی اصلاح اور ان کی فاقہ مستی کا علاج۔ چنانچہ
 میں نے بعض جگہ زراعت کے اصلاح شدہ طریقوں کو رواج دینے کی کوشش کی
 مگر افسوس کہ جیسا کہ میں بعد میں لکھوں گا۔ حالات نے مساعدا نہ کی۔ اس کے لئے
 روپیہ کی بڑی ضرورت تھی اور اب افغانستان کی بے رخی سے ہمارا سہارا صرف
 ہندوستان ہی رہ گیا تھا۔

معمولی حالات میں ہندوستان سے ہمارے پاس کافی روپیہ پہنچ جاتا تھا۔
 اور میرا خیال ہے کہ اگر حالات سرعت سے بدل نہ جاتے تو یقیناً وہ رقم ہمدانی
 تمام اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بہت کافی ہوتی، مگر ہندوستان کے حالات
 یک لخت بدل گئے۔ گورنمنٹ انگریزی جو جنگ کی ابتدا میں بالکل تیار نہ تھی، اپنے
 بے شمار وسائل کو کام میں لا کر فوجی تیاریاں مکمل کر رہی تھی اور بہت سی گورا فوج

سردوں کی ناکہ بندی کے لئے آرہی تھی۔ دوسرے ہندوستان میں گرفتاریوں اور
 نظر بندیوں کی وجہ سے بڑے بڑے لیڈر نہایت خفیہ طور پر ہمارے قاصدوں سے
 ملاقاتیں کرتے اور زیادہ روپیہ ارسال کرنے سے ڈرتے تھے کہ مبارک انگریزی سی
 آئی ڈی کے آہنی پنجہ میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی جن
 کے متعلق میں پہلے بھی لکھا آیا ہوں کہ پاکستان کے تقریباً تمام مولوی ان کے شاگرد
 اور مرید تھے ہمارے پاس آنے کے لئے تیار تھے اور ان کے شاگرد رشید مولوی
 محمد میاں اور مولانا کے خاص الخاص آدمی ہمارے پاس پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے
 وعدہ کیا کہ مولانا محمود الحسن صاحب کو دیوبند سے چمکنڈے آئیں گے اور انھیں
 امیر المجاہدین بنا کر تحریک جہاد کو تیز تر کر آئیں گے۔ مگر گورنمنٹ انگریزی نے بھی
 فوراً مولانا مرحوم پر سخت چوکی پہرہ مقرر کر دیا۔ ادھر میرے والد ماجد مولانا عبد القادر
 قصوری پر بھی سخت نگرانی شروع کر دی۔ اب مولانا صاحب تو اس قدر مجبور ہوئے
 کہ انھوں نے فوراً یہ ارادہ کیا کہ حج بیت اللہ کے ارادے سے حجاز چلے جائیں اور
 وہاں سے ایران اور افغانستان ہوتے ہوئے ہمارے پاس چمکنڈے تشریف لے
 آئیں۔ سرکار انگریزی کی اتنی جرأت تو نہ ہوئی کہ انھیں اس ارادے سے روک دی
 مگر ایک جاسوس مولوی کو ان کی معیت میں اپنے خرچ پہنچ دیا۔ اس مولوی (د) میں
 بالارادہ ان کا نام نہیں لیتا کیونکہ بہت سے لوگ انھیں جانتے ہیں) کا کام دو گونہ
 تھا۔ ایک تو نہایت ہوشیاری سے مولانا کے ارادوں کی اطلاعات سرکار
 انگریزی کو پہنچانا۔ دوسرے ان کے منصوبوں کو ناکام بنانا۔ چنانچہ ان مولوی
 صاحب کو خلاف توقع پوری کامیابی ہوئی اور بد بخت شریف حسن نے حضرت مولانا
 کو نظر بند کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا اور انگریزوں نے حضرت کو بالٹا میں
 نظر بند کر دیا۔ ادھر امیر کابل کی بے رخی نے امیر عبدالجبار، جہتر صاحب چترال اور

نواب امب کو بھی بھڑکا دیا اور انہوں نے صاف کہا کہ ہم اکیلے کیونکر انگریز کے غصے کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ حقیقت میں ان کا وعدہ امیر صاحب کی لشکر کشی کے ساتھ مشروط تھا۔ اس لئے اب ان کا علائقہ انگریز کے خلاف ہماری طرف جھکناموت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ مگر بھڑائی میں یہ ضرور کہوں گا کہ ان کے دلوں میں ہندستان میں ایک اسلامی حکومت قائم کرنے کا خیال ضرور تھا اور اگر اس میں کامیابی کی کوئی صورت دیکھتے تو وہ ضرور شامل ہو جاتے۔

بہر حال یہ تو ہمارے لئے ممکن نہ تھا کہ امیر حبیب اللہ خاں کے خلاف ایک لفظ زبان سے نکالے، مگر خدا کی شان کہ عامۃ الناس کو امیر صاحب کی اس بے رنجی بلکہ دشمنی کا احساس ہونے لگا اور اکثر ہوشمند خواتین نے ہم سے کہنا شروع کیا۔ کہ امیر صاحب کو تخت سے اتار کر کسی "مسلمان" کو بادشاہ بنانا چاہیے۔ بلکہ بعض سادہ لوح افغانوں نے مجھ سے یہاں تک آن کر کہا کہ "ملا صاحب! آپ کو معلوم ہے یہ فرنگی اس قدر عیار ہے کہ ہمارے حبیب اللہ خاں کو چرا کرے گیا ہے اور اسے قتل کرے ایک فرضی حبیب اللہ کو اس کی جگہ بٹھایا گیا ہے تاکہ ہمارے کام میں کشمکش نہ ڈالتا رہے۔۔۔۔۔" لیکن میری اپنی قلبی کیفیت عجیب تھی۔ جوں جوں امیر حبیب اللہ کی منافقت بے نقاب ہوتی جا رہی تھی میرے دل میں انگریز دشمنی کے جذبات روزانہ اور زیادہ مشتعل ہوتے جاتے تھے۔ اور میری تقریریں اس دور میں نہایت سخت اشتعال انگیز اور انگریزی نفرت سے معمور ہو گئی تھیں۔ میں اپنا تمام غصہ انگریز کے خلاف نکالتا تھا۔

مجھے صحیح طور پر یاد نہیں کہ میں نے کتنے ہفتے دورہ کیا اور کن کن علاقوں کا دورہ کیا، مگر اتنا یاد ہے کہ میرا دورہ بہت لمبا چڑا تھا اور میں نے ہند، جہونہ، ہاجورا، صوت، دیر، چترال، امہ وغیرہ کے اکثر علاقوں کا دورہ کیا۔ یا لائے

سندھ کی اس وادی میں دریا کا پانی اس قدر شفاف شیریں اور ٹھنڈا ہوتا ہے کہ
 جون جولائی کی گرمیوں میں اس کے پینے سے دانت بچے لگتے تھے نہایت ہاضم
 اور مقوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے بسنے والے لوگ نہایت قوی ہیکل خوبصورت
 اور تنومند ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی زندگی کچھ ایسی سادہ اور فطری ہوتی ہے
 کہ میں نے ان میں بہت کم بیماریاں دیکھیں اور عموماً لوگوں کی عمریں بہت لمبی کئی لوگ
 ایسے ملے جنہوں نے حضرت سید احمد شہید کی لڑائیاں دیکھی تھیں اور ان کی عمر اس
 وقت سو سال سے متجاوز تھی۔ ان کی غذا بھی بالکل سادہ اور تکلفات سے خالی۔
 اخلاقی لحاظ سے بھی ان کی حالت قابل رشک تھی اور میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اگر
 اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہوگی تو شاید ایسے ہی بااخلاق اور بہادر لوگوں سے ہوگی۔

اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اس دوران میں انگریزوں نے بھی کوشش
 کی کہ میرے دورہ کو ناکام بنا دیں۔ اور اگر میں کبھی ان کی سڑک پر سے گزروں تو
 مجھے گرفتار کر لیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک رات ہم چترال کی سڑک کے کنارے ایک گاؤں
 میں پہنچے۔ وہاں ایک ندی کے ساتھ ساتھ انگریزی سڑک چترال کو جاتی تھی۔ سڑک
 کو پار کر کے صوات کی سرحد میں داخل ہونا تھا۔ اور اگر سڑک کا راستہ اختیار نہ
 کیا جاتا تو ہمیں کئی دن کا چکر کاٹ کر پھر اسی جگہ آنا پڑتا۔ اس لئے ہم نے خیال
 کیا کہ چلو اس سڑک پر سے گزر چلو۔ انگریزوں کو بھی اس کا علم ہو گیا۔ چنانچہ اس
 تمام سڑک پر گوردن کا پہرہ لگا دیا گیا اور میرے گھر قبضہ کی تلاش کے لئے کریمے کئی
 فوٹو ان گوروں کو پہنچا دئے گئے۔ یاغستانی قبائل سے انگریزوں کا معاہدہ تھا کہ
 وہ ان سے کسی قسم کا تعرض نہیں کریں گے اور وہ آزادانہ سڑک کے پار آتے
 جاتے تھے۔ مگر میری صورت دوسری تھی۔ میں قانوناً انگریزی رعایا تھا اس لئے
 انگریز مجھے گرفتار کر سکتے تھے۔

اس گاؤں میں ہمیں بھی اطلاع پہنچ گئی کہ محمد علی کو گرفتار کرنے کے لئے پورا دستہ سڑک پر متعین کر دیا گیا ہے مگر میں اور تین چار ساتھی افغانی ملاؤں کے لباس میں رات کے آخری حصے میں سڑک چھوڑ کر ندی پار کر گئے۔ گوروں کے ساتھ ایک مسلمان سردار تھا جس نے پشتوؤں میں پوچھا کہ "کون جبار ہا ہے" میرے ساتھی نے جواب دیا کہ "یا غستانی قبائل کے ملاں" اس پر انہوں نے کہا "اچھا جاؤ" اور ہم پار ہو گئے۔ صبح کی نماز کے بعد ہمارے قافلہ نے سڑک پار کی۔ گوروں نے ایک ایک شخص کو دیکھا۔ محمد علی ہوتا تو اُسے گرفتار کرتے۔ انہوں نے سوچا کہ شاید محمد علی فرار ہو گیا اور واپس گیا۔ مگر ان کی لاعلمی زیادہ دیر تک قائم نہ رہی کیونکہ اُس دن میں نے جمعہ کا خطبہ صوات میں دیا اور نہایت دھڑکتے سے انگریز کے خلاف تقریر کی۔

صوات میں ہم امیر عبدالجبار صاحب بادشاہ صوات کے جہان ہوئے۔ یہ غالباً صوات کے سادات میں سے تھے اور ہندوستان میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئے اور مرزا غلام احمد کے مرید ہو گئے جب مرزا غلام احمد کی جماعت حکیم نور الدین کی وفات پر دو جماعتوں میں بٹ گئی تو کچھ لاہوری پارٹی میں شریک ہو گئے۔ لاہوری پارٹی مرزا صاحب کو نبی نہیں مانتی اور ختم نبوت کی بھی اس معنی میں قائل ہے جس معنی میں عامۃ المسلمین مانتے ہیں۔ لیکن یاغستان میں لوگوں کو احمدیت کے نام سے چڑھ گئی تھی اور ان کے لئے لاہوری اور قادیانی دونوں برابر تھے۔ اس لئے عبدالجبار صاحب اپنی عزائم چھپاتے تھے اور عامۃ المسلمین کی مساجد میں جاتے اور ان کے ساتھ نماز پڑھتے تھے، بلکہ بسا اوقات اپنی احمدیت سے انکار بھی کرتے تھے۔ نہایت خوش پوش اور خوش طوار، مہذب انسان تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے جو بلند قامت، تعلیم یافتہ، خوش رو و جوان تھے۔ یہ سب نہایت خلیق اور سنجیدہ اور درود رکھنے والے

مسلمان تھے، لیکن انگریزوں نے بری طرح ان کا ٹیلو ادھار رکھا تھا وہ صاحب زادہ
 عبدالقیوم یا سر جارج روس کیل کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ کیونکہ
 صاحب زادہ انھیں ہر وقت آنکھیں دکھاتا رہتا تھا کہ تم ہمارے خلاف ہو گے
 تو ہم نے تمہاری احمدیت کا بھانڈا پھوٹا۔ ان کے مد مقابل اخوند صاحب صوات
 مرحوم کے نواسے پادشاہ گل تھے۔ یہ بھی خاندانی سید اور یاغستان کے بہت بڑے
 سجادہ نشین تھے۔ اخوند صاحب صوات کے بہت بڑے پیر اور ملا تھے۔ حضرت سید
 احمد صاحب بریلوی کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے تھے، لیکن بعد میں جب ان کے
 خلاف وہابیت کا الزام لگایا گیا تو یہ نہ صرف ان سے علاحدہ ہو گئے بلکہ نام روایت
 کے مطابق ان کی مخالفت میں سکھوں اور سٹھانوں سے مل گئے۔ بہر حال مجھے ان
 واقعات کا کوئی علم نہیں، لیکن یہ سید صاحب کے بڑے مخالفین میں سے تھے۔ ان کے
 اولاد نرینہ شاید کوئی نہ تھی اس لئے نواسے ہی سجادہ نشین قرار پائے۔ نواسے بالکل
 جاہل قسم کے پٹھان تھے اور گوہم سے بہت خلق سے پیش آتے تھے اور ہر طرح سے
 تعظیم و تکریم کرتے تھے مگر ان کے مزاج میں ایک المٹھ پین تھا جو خاندانی امیر زادوں
 کا امتیازی وصف ہوتا ہے۔

بہر حال ہم امیر عبدالجبار کے مہمان ہوئے۔ انھیں صاحب زادہ عبدالقیوم
 سے پہلے ہی تندیہ کی جاچکی تھی کہ اگر تم نے گورنمنٹ انگریزی کے باغیوں کو اپنے ہاں
 ٹھہرایا تو تمہاری خیر نہیں۔ مگر انھوں نے کہا کہ قبائلی رسم کے مطابق میں مہمانی کے لئے
 مجبور ہوں۔ ہم غالباً ایک دن ان کے ہاں ٹھہرے۔ رات کو تخلیہ میں میری اور طاہشیر
 صاحب کی ان سے دل کھول کر باتیں ہوئیں اور یہی اس امر سے خاص خوشی ہوئی کہ وہ
 ایک روشن خیال مسلمان تھے اور اسلامی سیاسیات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے،
 لیکن انگریز کے دباؤ کی وجہ سے بالکل بے دست و پا تھے۔ انھوں نے ہمیں بتلایا کہ

امیر حبیب اللہ کو امام بنانے میں ہم نے بڑی سخت غلطی کی ہے کیونکہ وہ ایک بے کار عیاش اور دنیا پرست بادشاہ ہے۔ جسے اپنے روزمرہ کے اخراجات کے لئے روپیہ کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے اس لئے وہ مجبور ہے کہ انگریز کے سامنے ہاتھ پھیلائے رکھے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ حقیقت میں ہماری تمام تحریک کا محور سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنت ہیں، لیکن نشان دہی کے لئے امیر حبیب اللہ کو سامنے رکھ چھوڑا ہے کیونکہ سلطنت کے معاملات کی وجہ سے اعلیٰ حضرت کی شمولیت ضروری تھی۔ آخر صلح و جنگ کے مسائل نائب السلطنت صاحب اپنے بڑے بھائی کی موجودگی میں ان کی اجازت کے بغیر کیوں کر طے کر سکتے ہیں۔ اس لئے لا مجالاً اعلیٰ حضرت کو اس تحریک میں شامل کرنا ضروری تھا اور جب انہیں شامل کیا تو وہ بحیثیت صدر کے ہی شامل ہو سکتے تھے۔ پھر ہم نے کہا کہ اگر امیر صاحب علانیہ میدان میں نہ بھی اترے تو بھی ہمارا مقصد تو حاصل ہو جائے گا یعنی ترکوں اور اسلام کے دشمن کو پریشان تو کریں گے۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ خفیہ طور پر میں جس قدر بھی مدد کر سکوں گا کروں گا۔ علانیہ تو میں کچھ کر نہیں سکتا۔

ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ ہماری وجہ سے امیر عبد الجبار کو صوات کے تخت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ گو ان کے خلاف مرزائیت وغیرہ کے الزام تھے مگر ان سب کی تہہ میں ہماری تحریک کے ساتھ ہمدردی تھی جس نے انہیں سرکار انگریزی کا معتبوب بنا دیا تھا۔ ان کی جگہ بادشاہ گل صاحب کو صوات کا والی بنا دیا گیا۔ ہم امیر عبد الجبار صاحب کے بعد بادشاہ گل صاحب کے ہاں بھی گئے اور صوات کا دورہ کر کے سڈا کے ملا صاحب کے ہاں بھی حاضر ہوئے اور ان سے ملے۔ یہاں ہمیں ایک عجیب قسم کے حشرات الارض سے پالا پڑا۔ پتو اور کھٹمل تو آپ نے سن رکھے ہوں گے ہر شخص جو پہاڑوں پر جاتا ہے یا اسے ریل میں سفر کرنے کا اتفاق ہوتا ہے۔

ان سے خوب واقف ہے۔ لیکن یاغستان میں ایک تیسری قسم انہی کی پائی جاتی ہے۔ جسے یاغستانی لوگ بڑوڑا کہتے ہیں یہ اتنا ظالم ہے کہ اگر کسی مکان میں گھس جائے تو پپر مکینوں کو نکال کر ہی دم لیتا ہے۔ یہ لپٹو کے برابر ہوتا ہے لیکن اس قدر ظالم کہ ایک دفعہ بدن پر پھر جانے سے تمام بدن پر سرخ چمٹے پڑ جاتے ہیں اور ان میں اس قدر سخت جلن اور کھجلی ہوتی ہے کہ لاماں الحفیظہ صوات کے ایک گاؤں میں مجھے بھی بڑوڑا کا تجربہ ہوا۔ ایک رات ایک بڑوڑا میرے کرتے میں گھس گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ تمام بدن پر سرخ آیلے پڑ گئے۔ اور میں کھجائے کھجائے نڈھال ہو گیا۔ تمام رات نہایت مشکل سے آنکھوں میں کاٹی۔ صبح ہوتے ہی گندھک اور مکھن منگو کر اس کا مرہم بنا کر تمام جسم پر ملا۔ دو تین گھنٹہ دھوپ میں بیٹھنے کے بعد گرم پانی سے غسل کیا تو قدرے سکون ہوا۔ تین دن تک مسلسل ہی علاج کرنے کے بعد آرام ہوا۔ اس کے بعد تو میں کسی جہان خانہ میں قیام کرنے سے پہلے پوچھ لیتا تھا کہ یہاں بڑوڑا تو نہیں ہے۔

صوات کے لوگ انگریزی اثر میں نسبتاً زیادہ تھے لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہر جگہ ہمارا نہایت پر تپاک خیر مقدم کیا گیا۔ گو ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہماری ڈائری روزانہ انگریزوں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ مگر ہمارا کوئی کام خفیہ نہ تھا۔ ہم یہ یقین کر چکے تھے کہ اب خواہ فتح ہو، خواہ شکست ہندوستان اور اپنے اعزہ تو ہم سے ہمیشہ کے لئے چھٹ چکے ہیں۔ اس لئے جس قدر امیر حبیب اللہ کی طرف سے یاوسی ہوتی تھی اسی قدر میرے کام میں تیزی اور ہمارے پروپیگنڈا میں انگریز کے خلاف زیادہ زور دار زہر فاشانی ہونے لگی۔

نوار تلخ ترے زن چو ذوق بغیر کم یابی
 ہدی را تیر ترے خواں چو محمل را گراں بنی

افسوس ایسے بے نظیر قبائلی جن میں ترقی اور حضارت کے فطری جوہر موجود تھے اور جو اسلام کی بے پناہ تلوار ثابت ہو سکتے تھے انگریزی روپیہ کی وجہ سے بے کار عیش پسند آرام طلب اور ایمان سے ہٹی دامن ہوتے جا رہے تھے۔ انگریزوں نے انھیں خوشامدی اور چاچلوں بنا دیا تھا۔ جس قبیلہ کا ایک دفعہ انگریزوں سے پالا پر گیا وہ ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد ہو گیا۔ اس کے قابل افراد یا تو انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر انگریزوں کے نمک خوار اور خیر خواہ ہو گئے اور ان کی بہادری اور شجاعت انگریزوں کا نام بلند کرنے کے لئے وقف ہو گئی یا پھر انگریزوں کے خوشامدیوں اور جی حضور یوں کی فہرست میں داخل ہو کر اذل الناس کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔ گو مجھے اب ان لوگوں سے زیادہ تعلق نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اب بھی اگر ہماری حکومت پاکستان انگریزوں کی پالیسی کو ترک کر کے انھیں تمدن اور تعلیم سے آشنا کرنے کی کوشش کرے تو وہ بہت مفید ہو سکتے ہیں اور اسلام کا نام بلند کرنے میں پاکستان کے دست و بازو بن سکتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس دورے کے دوران میں بھی ہم انگریزوں کے خلاف عملی اقدام کرتے رہتے تھے کیونکہ ہمارا اصل مقصد اب صرف انگریزوں کو پریشان کرنا ہی رہ گیا تھا۔ اس کے لئے ہم مختلف علاقوں سے چھاپے، شب خون مارتے رہتے تھے، ان چھاپوں سے انگریزی حکومت کافی سے زیادہ پریشان رہتی تھی۔ چنانچہ ہندوستان کے انگریزی اخباروں میں ان ڈاکوں کے حالات عجب رنگ آمیزی سے شائع ہوتے تھے ان ڈاکوں کو "دیوانہ ملا" اور اس کے فریڈوں کی کارستانیوں سے تعبیر کیا جاتا تھا اور قبائلی مجاہدین کی وحشت اور بہرہ ریت کی داستانیں خوب مبالغہ سے شائع کی جاتی تھیں۔ ان سے ایک تو ہمارے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پھیلانا

دوسری طرف ہندو مسلمان اتحاد کو نقصان پہنچانا ہوتا تھا۔ ان فرضی قصوں
 میں ہندو نوجوان لڑکیوں کے اغوا کی داستانیں، ان کے لونڈی بنا کر فروخت
 کرنے کے قصے اور بیاہ شادی کی پارٹیوں کے لٹنے کی کہانیاں وغیرہ خوشام
 کی جاتی تھیں۔ چنانچہ پانیر اور سول کے اس پروپیگنڈا کا اثر یہ ہوا کہ اکثر ہندو
 لیڈر نہ صرف افغانستان اور یاغستان سے بلکہ مسلمانوں سے بد دل ہونے
 لگے۔ چنانچہ جب میں ہندوستان اٹھا اور گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک شروع
 کی تو گاندھی جی نے غالباً ۱۹۲۰ء میں الہ آباد میں پنڈت موتی لال جی کے دولت
 کدہ پر ہندو مسلمان لیڈروں کا ایک بہت بڑا جلسہ کیا جس کا مقصد ہندوؤں کو
 مسلمانوں کی تائید و حمایت میں سستی گمراہی کے لئے تیار کرنا تھا۔ چنانچہ حاصل
 ریزولوشن جس کا مقصد یہ تھا کہ چونکہ مسلمان بھائی خلافت کی بربادی کی وجہ
 مذہباً مجبور ہو گئے ہیں کہ انگریزوں سے عدم تعاون کریں اس لئے ہندوؤں کا بھی ملکی
 فرض ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کا ساتھ دیں۔ اس ریزولوشن کو پیش کرنے کا
 قرعہ میرے نام پر آیا۔ چنانچہ میں نے ایک مفصل انگریزی تقریر میں خلافت اسلامیہ
 کے متعلق انگریزوں کی وعدہ خلافیوں اور بد عہدوں کی داستان کو دہرائے
 ہوئے اسلامی نقطہ نظر کو واضح کیا اور ہندوؤں سے اپیل کی کہ انگریزوں کے خلاف
 ہم سے مل کر جدوجہد کریں۔ جب میری تقریر ختم ہوئی تو بعض ہندو لیڈر بالکل
 چراغ پا ہو گئے۔ چنانچہ سب سے پہلے سنر بیٹ اٹھیں اور ایک نہایت زوردار
 تقریر میں انہوں نے میری مخالفت کی اور پانیر کے بعض اقتباسات پڑھ کر سناٹے
 اور کہا کہ کیا ہم اس قوم کے ساتھ تعاون کریں جو ہماری لڑکیاں اٹھائے جانا۔
 اور انہیں لونڈی غلام کے طور پر فروخت کرنا اپنا مقدس مذہبی فریضہ سمجھتی ہے۔
 ان کے بعد لال لاجپت رائے نے نہایت زوردار الفاظ میں مسلمانوں پر یہ الزام

لگایا کہ یہ ہندو کو لوٹنا اور اس کی عرت و حرمت کو پامال کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں اور اپنی تائید میں وہی سول اور پانیر کی سرکاری اطلاعات بتائیں گیں۔ ان کے بعد غالباً پنڈت مالویہ یا کوئی اور ہندو لیڈر بولے۔ بس پھر کیا تھا۔ جلسہ کارنگی ہی اکھڑ گیا اور خود گاندھی جی پریشان ہو گئے۔ اس پر یہیں صاحب صدر کی اجازت سے اٹھا اور میں نے بھی نہایت زوردار تقریر میں انگریزوں کے جھوٹ کا پول کھولا۔ میں نے کہا کہ آپ سب لوگ مجھ سے زیادہ اس تاریخی حقیقت سے واقف ہیں

کہ انگریزی سیاست کا محور ہی (Divide and rule) (ہندو و مسلمانوں کو لڑاؤ اور ہندستان پر حکومت کرو) ہے۔ اس غرض کے لئے اس نے ہماری ساری تاریخ کو مسخ کر کے ہندو مسلمانوں کی رزم آرائیوں کی ایک مسلسل داستان کے طور پر پیش کیا ہے اور ہم لوگ باوجود اس علم و یقین کے کہ انگریزیہ تمام جھوٹ محض ہیں لڑانے کے لئے گھڑ رہا ہے پھر بھی ان اکاذیب کو باور کر کے ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کی آج کی تقریروں سے میں انگریزی دانشمندانہ سیاست کا قابل ہو گیا کہ بمصدق۔

عیب کردن را ہنرے با شد

انہوں نے یاغستان کے متعلق کس خوبصورتی سے جھوٹا پروپیگنڈا کیا ہے کہ مسز اینی بسینٹ اور لالہ لاجپت رائے جیسے انگریزی امپیریلزم کے دشمن بھی اس کے دام ترؤیر میں پھنس گئے ہیں چونکہ میں یاغستان میں اس تحریک کا لیڈر رہ چکا ہوں اور مجھے ان مزعومہ ڈاکوں کا ذاتی علم ہے اس لئے میں پورے وثوق سے یہ کہتا ہوں کہ انگریزی رپورٹیں محض من گھڑت اکاذیب کا طومار ہیں اور میں انگریز کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ مجھ پر عدالت میں مقدمہ چلائے تاکہ مجھے موقع مل سکے کہ ان اطلاعات کا تار و پود بکھیر کر ثابت کروں کہ وہ سفید جھوٹ ہیں۔ چنانچہ میں دعویٰ

سے کہتا ہوں کہ یہ ڈاکے نہیں شب خون تھے اور ان میں کسی ہندو پر حملہ نہیں کیا گیا کسی ہندو لڑکی کو اغوا نہیں کیا گیا، کسی بارات کو نہیں لوٹا گیا۔ ان کا مقصد تو صرف انگریز کو پریشان کرنا اور نقصان پہنچانا تھا۔ ہندوؤں نے ہمارے ساتھ ان شب خونوں میں تعاون کیا ہے اور برابر کے شریک رہے ہیں۔ یہ شخص انگریزی پروپیگنڈا تھا کہ کس طرح اسے ہندو مسلم سوال بنا کر ان کو آپس میں لڑایا جائے اور ہندو مسلم اتحاد کو نقصان پہنچا کر تحریک آزادی کو کچل دیا جائے۔ اس کام کے لئے گورنمنٹ انگریزی کے چند تنخواہ دار غنڈے ملازم ہیں۔ وہ ان کے اشاروں پر کسی ہندو لڑکی کو چھپڑ دیتے ہیں اور خود روپوش ہو جاتے ہیں۔ بس ایسے فرضی واقعات کو لے کر رائی کا پہاڑ بنا کر ہمارے مجاہدین کے سر چپکا دیا جاتا ہے۔

قصہ مختصر میں نے اس قدر وضاحت سے انگریزی پروپیگنڈا کا پول کھولا کہ مسٹر بیسنٹ اور لالہ لاجپت رائے کو اعتراف کرنا پڑا کہ وہ غلطی پر تھے۔ اور گاندھی جی نے ایک نہایت جو شیعلی تقریر میں کہا کہ میں بھائی محمد علی کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو سچ اور حقیقت پر بنی خیال کرتا ہوں اور میں ان کے ساتھ اس چیلنج میں شریک ہوں کہ اگر وہ جھوٹے ہیں تو گورنمنٹ ان پر مقدمہ چلائے۔ خیر۔ اس جلسہ کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ ریزولوشن پاس ہو گیا۔ مگر میں دل ہی دل میں انگریز کی حکمت عملی کی داد دیتا رہا کہ کس ہوشیاری اور دوراندیشی سے انھوں نے یاغستان کو بد نام کیا اور مجاہدوں کے گروہ کو ڈاکوؤں اور غنڈوں کا غول ثابت کرنے کی کوشش کی۔ افسوس موجودہ زمانہ کی رقابتیں اور نفرتیں تقریباً اوتے فی صدی اسی جھوٹے پروپیگنڈا کا نتیجہ ہیں۔ اگر آج ہم کسی طرح سے جھوٹے پروپیگنڈا کو دنیاوی سیاست سے خارج کر دیں تو وہی نوع انسان اس اور اطمینان کا سانس لینے لگیں۔ مگر حکومتیں اپنے اغراض

مشمومہ کے پورا کرنے کے لئے یا حکومتوں کے لیڈر اور ارباب اقتدار اپنی ہوا و ہوس کی خاطر غلط اور جھوٹا پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں اور بے دریغ حق و صداقت کا خون کرتے رہتے ہیں۔

آدم ہر سر مطلب۔ ہم نے مختلف جگہوں سے انگریزی سرحدات پر چھاپے مارنے شروع کئے۔ مجھے ان چھاپوں کی تفصیلات یاد نہیں۔ ہاں اگر انگریزی اخبارات کے پچھلے فائل دیکھے جائیں تو ان کی جھوٹی رپورٹوں سے کسی حد تک سچی رپورٹیں مرتب کی جاسکتی ہیں، لیکن قارئین کرام کی دل چسپی کے لئے دو ایک جو مجھے اچھی طرح سے یاد ہیں درج کرتا ہوں۔ ایک دفعہ ہم نے مچنی کے تھانہ پر شب خون مارنے کا ارادہ کیا۔ مچنی کا تھانہ شب قدر کے قلعہ کی حفاظت میں ہے اور چند میل دور علاقہ کے اندر واقع ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے انگریزوں نے برقائے ہوئے کانسٹوں والے تار لگا رکھے تھے اور ان کے قریب جاتے ہی انسان تاروں کی طرف کھینچ کر پڑتا تھا اور برقی صدمہ سے جان بحق ہو جاتا تھا۔ میں نے پہلے تو ایسی قینچیاں بنائیں جو ان تاروں کو کاٹ سکتی تھیں۔ چنانچہ ان کو کاٹ کر راستہ بنایا۔ پھر تجویز کی گئی کہ شب خون مارنے والی جماعت کے دو حصے کئے جائیں۔ چھوٹا حصہ مچنی کے تھانے کو گھیر کر فائر کرنا شروع کر دے اور بڑا حصہ شب قدر اور مچنی کی درمیانی پختہ سڑک کے دونوں طرف گھنے درختوں میں چھپ جائے۔ رات اندھیری تھی۔ مچنی کے تھانہ والوں نے شب قدر کے قلعہ کو شیشہ کے ذریعہ حالات سے اطلاع دی۔ وہاں سے کلب ان کی مدد کے لئے گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلی۔ ان کے ساتھ کئی خیریں کار تو سوں کی تھیں جن میں وقت رسالہ عین وسطا میں پہنچا تو ہمارے آدمیوں نے کمین گاہوں سے اس پر فائر کرنے شروع کئے۔ رات کی تاریکی نے سواروں کو پریشان کر دیا اور وہ تتر بتر ہو کر رات کی سیاہی میں غائب ہو گئے۔ کار تو سوں کی لدھی ہوئی خیریں وہیں رہ گئیں۔ ان میں سے

بعض زخمی ہو گئی تھیں، لیکن ہم سب کارٹوسوں کو لے کر واپس آ گئے۔ ہمیں اپنے منصوبہ کی کامیابی اور انگریز کی ہزیمت پر مسرت ہوئی۔ چند روز بعد اس شخصوں کی انگریزی تفصیل پڑھ کر ہمیں بہت مہسنی آئی کہ انگریز اپنی ہزیمت کو چھپانے کے لئے کیسے کیسے جھوٹا اختراع کرتا ہے۔ اس میں یہ بھی تھا کہ انگریز نے ہماری ناکہ بندی (Blockade) کر دی ہے۔ اس ناکہ بندی کی کیفیت یہ تھی کہ ہمارے یہاں ہندوستان کی تمام تجارتی اشیا پشاور سے قدرے قلیل زیادہ نرخ پر ملتی تھیں اور یہ زیادتی بھی اس لئے تھی کہ تمام سامان گدھوں اور خجروں پر لدا کر آتا تھا۔ ہر قسم کا کپڑا جس کی ہمارے یہاں کھپت تھی بافراط ملتا تھا۔ چینی، چائے، دالیں، پشاور کی سبزیاں وغیرہ انگریزی ادویہ، جاپانی کھلونے، مٹھائیاں، ہندوستانی اور انگریزی دونوں قسم کی۔ غرض استعمال کی تمام چیزیں یعنی (Consumer's Goods) سبھی ملتی تھیں، لیکن انگریز برابر اخباروں میں یہی ڈھنڈورا پیٹ رہا تھا کہ ہماری ناکہ بندی سے یاغستانی قبائل تنگ آ گئے ہیں۔ بالآخر ایک دن یہ خبر شائع ہوئی کہ قبائلیوں نے معافی مانگ لی ہے اور آئندہ نیک چلنی کی ضمانت دی ہے اس لئے ان کی ناکہ بندی ختم کر دی گئی ہے۔ قصہ مختصر انگریزی اخبارات کی خبریں ہمارے متعلق ہمارے لیے خاص تفریح کا سامان مہیا کرتی تھیں۔

بندوق کے نشانہ میں قبائلیوں کی جہارت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا اور جرمن نشا پچیوں کا کہنا تھا کہ یہ لوگ دنیا کے بہترین نشا پچیوں میں شمار ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ تو کئی دفعہ ہوا کہ رات کے وقت انگریزی تھانہ کے کسی گارڈ نے سگریٹ سلگایا۔ ہمارے نشا پچی نے سگریٹ کی روشنی دیکھ کر گولی چلائی۔ سپاہی کے منہ سے گولی پار ہو گئی اور وہ وہیں گر کر ڈھیر ہو گیا۔ اس لئے گورنمنٹ انگریزی نے نہایت سخت احکام جاری کر دیئے تھے کہ رات کے وقت کوئی شخص سگریٹ یا دیاسلائی نہ

سلگائے اور نہ کوئی اور روشن چیز باہر نکالے تاکہ قبائلی بندوق کا نشانہ نہ بنا سکیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک مسلح موٹر نے ہمارے آدمیوں کا تعاقب کیا۔ اس زمانے میں مسلح موٹریں موجودہ زمانے کی مسلح موٹروں کی طرح گولی پروٹ نہیں ہوتی تھیں۔ ڈرائیور کے لئے ایک روزن سا ہوتا تھا۔ ہمارے ایک نشا پچی نے اس روزن میں تاک کر گولی ماری۔ ڈرائیور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ موٹر کی اور دوسرا آدمی اس کی جگہ آ گیا۔ ابھی موٹر اسٹارٹ بھی نہ ہوئی تھی کہ دوسرے فائر نے دوسرے ڈرائیور کو بھی عدم آباد پہنچا دیا۔ اسی طرح تیسرے کو بھی فنا کی گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس پر وہ گورے موٹر کے پیچھے سے فرار ہو گئے اور اسے وہیں چھوڑ گئے۔ ہم نے جا کر موٹر کا سر پر قبضہ کر لیا لیکن چونکہ ہمارے لیے وہ بیکار تھی اس لئے اس کے کارتوس اور بندوقیں تو ہم لے آئے اور موٹر کو توڑ پھوڑ کر بیکار کر آئے۔

غرض ایسے واقعات اس زمانے میں روزانہ ہوتے رہتے تھے جس سے ایک تو ہم انگریز کو پریشان کرتے رہتے تھے۔ دوسرے ان قبائلیوں کی توجہ ہم نے محض لوٹ مار سے ہٹا کر انگریز کی دشمنی کی طرف مبذول کر دی تھی۔ ہم بار بار ان لوگوں کو سمجھاتے رہتے تھے کہ خبردار کسی ہندو کو مت ستانا، کسی عورت کو اغوا مت کرنا، کسی قافلے کو مت لوٹنا، کیونکہ اس سے ہمارا جہاد فی سبیل اللہ کی بجائے فی سبیل الطاغوت ہو جائے گا اور مجھے یاد ہے کہ باوجودیکہ وہ لوگ پورے منظم تھے اور لوٹ مار میں یگانہ تھے، بلکہ لوٹ مار ان کی آمد کا اچھا خاصہ ذریعہ تھی، مگر پھر بھی انہوں نے ہمارے احکام کو بے چون و چرا تسلیم کیا اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے لشکریوں نے سوائے انگریز کے کیمپ پر شیون مارنے کے اور کوئی ڈاکہ نہیں ڈالا۔ یہ صحیح ہے کہ لوٹ مار ان لوگوں کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی اور

ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ان کی واقعی یہی حالت تھی کہ اپنے اور پرانے میں تمیز نہ کرتے تھے۔ اگر لوٹ مار کے لئے پرانے نہ ملے تو اپنوں کو بھی لوٹنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔

اور اس طرح ان میں قبائلی لڑائیاں شروع ہو جاتی تھیں جن کی مثال عربوں کی حرب و احس یا بکر و تغلب کی لڑائی کی سی تھی لیکن ہم نے وہاں پہنچ کر ان کو ایک راہ دکھا دی تھی کہ آپ بے شک لوٹ مار کریں لیکن صرف انگریز کو یا انگریز کے متعلقہ آسامیوں کو

لوٹیں۔ انگریزی رعایا کو اور ہندوؤں کو نہ لوٹیں۔ اور ایک دوسرے پر حملہ نہ کریں۔

چنانچہ اس کا بعضہ بہت اچھا اثر ہوا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب کوئی قبائلی میرے پاس اپنے کسی بھائی کی شکایت لے کر آتا تو میں اس سے کہتا کہ بھئی اسے

انگریز کے کھاتے میں لکھ لو۔ وہ حیران ہو کر پوچھتا کہ وہ کیا ہے میں کہتا کہ اس کا بدلہ

انگریز سے لو۔ یہ میرا جملہ وہاں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ اب تک وہ لوگ اسے

یاد کرتے ہیں کہ ”بڑے مولوی صاحب ہمیشہ کہتے تھے کہ دشمن صرف ایک ہے باقی سب

دوست ہیں۔ اس لئے جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو اس کا بدلہ انگریز سے لو۔“

میں یہ باتیں اپنی موجودہ ذہنی کیفیت کی رو سے نہیں لکھ رہا بلکہ میری

حسی الوسع یہی کوشش ہے کہ اپنے اس دور کی ذہنی کیفیت کا صحیح نقشہ کھینچنے کی کوشش

کروں لیکن ابتدا میں تو مجھے یہ بات بہت مشکل معلوم ہوئی مگر جوں جوں میں لکھتا جا رہا

ہوں اس زمانے کے کہنے نفوس از سر نو ابھر رہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ میں اُس

زمانے کے جذبات کی ترجمانی خاص محنت سے کر رہا ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ شاعر نے۔

شپِ آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد

میرے بیٹے ہی کہا تھا وہ واقعات حیرت انگیز تسلسل کے ساتھ اب میرے

سامنے آ رہے ہیں اور اگر میں انہیں تفصیل سے قلمبند کرنا شروع کر دوں تو شاید ایک

پوری کتاب مدون ہو جائے۔

بالجملہ ہمارا اصوات کا دورہ بھی بہت کامیاب رہا اب میں دیر اور امب کے علاقے میں داخل ہوا۔ نواب امب انگریزوں کا باج گزار تھا اور انگریزوں سے بہت خائف تھا، مگر اسے بھی یہ جرات نہ ہوئی کہ ہمیں روک دیتا بلکہ جب بھی میں امب گیا تو نواب صاحب نے مجھے اپنے مہمان خانہ میں ٹھہرایا اور رات کے گیارہ یا بارہ بجے کے قریب مجھ سے اور ملا بشیر صاحب سے ملاقات کرنے کے لیے آئے۔ نواب امب نہایت خوش گفتار اور خوش وضع نوجوان تھے۔ مگر انگریزی اثر نے انہیں عیش و عشرت کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ بہت دیر تک ان سے ہماری کھلی کھلی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے انہیں اپنی تمام اسکیم سے مطلع کیا۔ انہوں نے بھی امیر عبدالجبار صاحب کی طرح امیر حبیب اللہ کی ذات کے متعلق شکوک پیش کئے وہ شکوک بالکل بجائے تھے۔ وہ بار بار یہی کہتے رہتے کہ ”میں تو اپنا سر دھڑ بٹکا۔ ریاست تک اسلام پر قربان کرنے کے لئے تیار ہوں بشرطے کہ کوئی لیڈر ایسا ہو جو امیر حبیب اللہ کی طرح خود عوض، لالچی اور عبداللہ ثبانیہ ہو۔“ ہم ان کی بات کی تردید نہ کر سکتے تھے۔ اس وقت رہ رہ کر میرے دل میں یہ خیال آتا کہ امیر حبیب اللہ کے پاس خود جاؤں اور انہیں اصل حالات سے مطلع کروں کہ آپ بھی سال (۱۱) کی طرح آلوؤں کی ایک پلیٹ کے عوض اتنی بڑی سلطنت سے ہاتھ دھو رہے ہیں۔ مگر میرا کابل جانا تو خارج از بحث تھا جب ملا بشیر اور

(۱۱) سال Saul قوریت کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بھائی تھے اور برابر انہی قانون کے مطابق وارث نبوت و سلطنت تھے۔ ایک دن انہیں سخت بھوک لگی تھی تو حضرت یعقوب سے انہوں نے کہا کہ مجھے ایک آلوؤں کی پلیٹ دو اور میں اس کے عوض میں اپنے حق سلطنت اور نبوت سے دست بردار ہو جاتا ہوں۔ چنانچہ حضرت یعقوب وارث بن گئے اور سال نبوت اور سلطنت دونوں سے محروم ہو گئے

نائب السلطنت امیر صاحب کو براہ راست پیر نہ لاسکے تو میں کس شمار میں تھا۔
 دیر اور امب کا علاقہ بھی پہاڑی علاقہ ہے۔ آب و ہوا نہایت خوشگوار اور
 عمدہ جگہ جگہ چٹے ابل رہے ہیں اور پہاڑی نالوں نے زمین کو خاصہ زرخیز بنا دیا ہے۔
 ان پہاڑی نالوں میں مچھلی کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ میں حیران ہو گیا۔ چنانچہ میں خود سفہ
 میں ایک دو بار مچھلی کا شکار کھیلا کرتا تھا۔ اور اتنی مچھلیاں پکڑتا کہ مجاہدین کے ہر گھر کو
 مچھلی کا حصہ جاتا۔ مچھلی پکڑنے کا طریقہ بھی عجیب ہے۔ بعد میں مجھے خود اس امر کا احساس
 ہوا کہ یہ طریقہ بہت بے رحمانہ ہے اس لئے میں نے اسے ترک کر دیا اور جال سے
 مچھلیاں پکڑنی شروع کر دیں۔ وہ طریقہ یہ تھا۔

ڈائنامیٹ (Dynamite) کے انگریزی کارتوس Cartridges ہوتے ہیں۔ یہ بتیاں یا قلم بڑی موم بتی کے برابر موٹی، مگر طول میں نصف ہوتی ہیں
 ایک طرف ان کے پلینے لگا ہوا ہوتا ہے۔ اب اس بارود کی بتی کو گیلے آٹے کے ایک
 گولے میں دبا دیتے ہیں اور صرف پلینے کو باہر رکھتے ہیں۔ اس گولے کو ایک مضبوط
 رسی کے ساتھ باندھ لیتے ہیں۔ شکار کا طریقہ یہ ہے کہ وہ نالے چونکہ بہت تیز
 رفتار ہوتے ہیں اس لئے جہاں کہیں راستہ میں کوئی چٹان ہوتی ہے وہاں پانی کا
 ایک گہرا حلقہ اس پتھر کے گرد بن جاتا ہے مچھلیاں بالعموم اس گہرے پر سکون
 پانی میں جمع رہتی ہیں۔ اب اس پتھر پر کھڑے ہو کر پلینے کو آگ لگا کر اس گولے کو پانی
 میں پھینک دیتے ہیں۔ پانی کے اندر جا کر وہ ڈائنامیٹ نہایت زور سے پھٹتا ہے۔
 اس کے دھماکے سے سینکڑوں مچھلیاں بے ہوش ہو جاتی اور سطح آب پر تیرنے لگتی
 ہیں۔ بس اس کے تھوڑی دور نیچے پانی کی رو کی طرف چند آدمی کھڑے کر دئے جاتے
 ہیں۔ وہ مچھلیوں کو پکڑ پکڑ کر لوگوں میں ڈالتے جاتے ہیں۔ اس طرح بڑی چھوٹی
 مچھلیاں سینکڑوں کی تعداد میں ایک ہی دفعہ پکڑی جاتی ہیں۔ چنانچہ مجھے یاد ہے

کہ ایک دفعہ صرف بڑی مچھلیوں کی تعداد گیارہ سو تھی۔ میں نے مجاہدین کے تمام گھروں میں مچھلیاں بانٹیں وہ لوگ بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ بالعموم ہنگامی ہوتے تھے اور مچھلی ان کی بہت مرغوب غذا تھی۔

سیر کی زمین بھی بہت زرخیز اور آب و ہوا نہایت معتدل اور عمدہ ہے۔ لہذا ہوتی ہوئی کھیتیاں خطہ کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہی ہیں۔ زیادہ تر وہاں کئی جوائے نہ ہوں، چاول پیدا ہوتے ہیں۔ مسور کی بکثرت کاشت ہوتی ہے۔ کیونکہ مسور کی وال ان لوگوں کا من بھاتا کھانا ہے۔ اکثر گھروں میں گائے بھینس بھی ہوتی ہے اور لوگ ان کا دودھ، وہی بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ شہد بھی بکثرت ملتا ہے اور وہاں شہد کی بڑی مکھیوں کی باقاعدہ پرورش ہوتی ہے، یہاں تک کہ بیٹی کو جہیز میں مکھیوں کی جوڑی دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے گھر میں شہد کا چھتہ لگا سکے۔ قریباً ہر گھر میں شہد کی مکھیوں کا بڑا چھتہ ہوتا ہے جو ایک طاقتور میں بنا ہوتا ہے۔ طاقتور میں ایک چھوٹا سا روزن باہر کی طرف ہوتا ہے۔ اس روزن سے شہد کی مکھیاں باہر بچھولوں سے رس چوسنے کے لئے روزانہ نکل جاتی ہیں۔ اندر اس طاقتور کا راستہ ہوتا ہے، جہاں گھر والوں کو شہد کی ضرورت ہوئی انہوں نے طاقتور میں دھنواں کیا۔ مکھیاں باہر نکل جاتی ہیں۔ وہ خود اس میں سے ایک اچھا خاصہ ٹکڑا مع موم کے کاٹ لیتے ہیں اور جہان کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

اسی علاقے میں حضرت سید احمد شہید بریلوی اور حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ کی جماعت ایک مقام اسمت میں مقیم ہو گئی تھی۔ جب بری سنگھ نلوہ نے ۱۲۳۹ء میں چند پٹھانوں کی غداری سے حضرت سید احمد صاحب کی کمین گاہ ہالا کوٹ پر حملہ کر دیا تو وہ پانچ ہزار سرفروش مجاہدین کی جماعت سکھوں کے ایک لشکر عظیم کے مقابلہ پر ڈٹ گئی گو ان کی تعداد قلیل تھی مگر وہ اس قدر بہادری سے لڑے کہ سکھوں

کے دانت کھٹے ہو گئے۔ حضرت سید احمد صاحب اور حضرت شاہ اسماعیل صاحب دونوں نے اس معرکے میں جام شہادت نوش کیا۔ پانچ ہزار میں سے قریباً دو تہائی وہیں شہید ہوئے باقی ماندہ افراد پہلے تو تڑپتے رہے مگر پھر اب کے راستے سے سمت کے مقام پر جا کر پناہ گزیں ہو گئے اور نئے سرے سے جماعت مجاہدین کی تنظیم و تشکیل میں مصروف ہو گئے۔ ان کی لیڈر شپ حیرت انگیز لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے فوراً ہی اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ یعنی انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر اسلامی حکومت قائم کرنا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے انہوں نے حیرت انگیز نظم و ضبط کا ثبوت دیا اور پٹنہ سے لے کر مدراس اور بنگلور تک اور پنجاب اور دہلی سے لے کر بنگال و آسام تک اپنی جماعت کی شاخوں کا ایک جال بچھا دیا ہر شاخ انگریز کے خلاف جہاد کی تلقین کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ اس جماعت کی تاریخ ہندوستان کے جہاد حریت کے ضمن میں آپ زرتے لکھنے کے قابل ہے مولانا لیاقت علی صادق پوری اور ان کے برادر اصغر مولانا عنایت علی صادق پوری۔ حضرت سید صاحب کے سچے جانشین تھے۔ ان لوگوں نے تقویٰ اور بہادری میں ایسی درخشاں مثالیں قائم کی ہیں کہ بلا مبالغہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہدِ مہنت ہند کے بعد کوئی جماعت جو جہاد، ایثار و ضدومیت کا ان سے بہتر نمونہ پیش نہیں کر سکتی۔ وہ اخلاقِ محمدی کا پیکر تھے اور اسلامی تعلیمات کی تصویر۔ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا اور ہندوستان میں ان کے خلاف ایک زبردست جماعت پیدا کرنا ان لوگوں کے وظائفِ حیات تھے۔ وہ سرتاپا صداقت اور ایثارِ مجسم تھے۔ عورتیں اپنے بچوں کو جہاد کے لئے وقف کر دیتی تھیں۔ اپنے زیور اور کپڑے تک اتار کر دے دیتی تھیں کہ مجاہدین کے لئے ہتھیار خریدے جائیں۔ انگریز اس جماعت سے اس قدر خائف تھا کہ جب وہ سیاسی ہتھیاروں سے ان پر قابو نہ پاسکا تو اس نے وہابیت کا ڈھونگ کھڑا کیا۔

اور اس جماعت کو وہابی کہہ کر بدنام کرنا شروع کیا تاکہ لوگوں کو اس جماعت کے ساتھ لگاؤ نہ رہے۔ چنانچہ بریلی کے ایک مولوی کو (غالباً ان کا نام غلام رسول تھا) ۵۰۰ روپیہ ماہوار پر ملازم رکھا اور انھیں اختیار دیا کہ جتنے مولوی چاہیں ملازم رکھ لیں۔ چنانچہ ان سرکاری تنخواہ دار مولویوں کا ایک پورا گروہ ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گیا اور مسجدوں میں پبلک جلسوں میں انھوں نے حضرت شاہ اسماعیل صاحب شہید کی تکفیر اور ان کی وہابیت کی تشہیر کرنی شروع کی۔ ان کے خلاف جھوٹے الزام تراشی گئے اور شاید روس نے سرمایہ دار ممالک کے خلاف اور سرمایہ دار ممالک نے روس کے خلاف اتنا جھوٹا اور اتنا زہریلا پروپیگنڈا کیا ہوگا جتنا کہ اس جماعت کے خلاف انگریز کے تنخواہ دار اجیروں نے کیا ہے

اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے وہابی تحریک کو کچلنے کے لئے ہر قسم کا تشدد اور دباؤ بھی استعمال کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اگر کسی شخص کو کسی شخص کے خلاف دشمنی ہوتی تو وہ جا کر جھوٹ موٹ بھی کلکٹر سے کہہ دیتا کہ فلاں شخص وہابی ہے تو اس کو پچاسی پر لٹکا دینے کے لئے یہ کافی تھا۔ ۱۸۶۹ء کا وہابی کیس اور اس کے بعد کئی

۱۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید کا نام نامی خاص طور پر اس لئے ہدف مطاع بنایا گیا کہ اول تو وہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے پوتے تھے اور اس خاندان کا علیٰ فیضان تمام اطراف عالم میں یہاں تک کہ مصر و حجاز میں بھی پہنچ چکا تھا اور قریباً ہر عالم حدیث اس خاندان سے تعلق رکھنے کو اپنا سرمایہ افتخار خیال کرتا تھا۔ اس لئے شاہ صاحب کو بدنام کرنے سے ساری تحریک کی جڑ کٹ جاتی تھی۔ دوسرے اکثر کتب شاہ صاحب کی ہی تصنیف ہیں۔ اس سے اکثر بندوستانی زعماء یہاں تک کہ مولانا آزاد وغیرہ کو بھی یہ غلط فہمی ہو گئی کہ اصل بانی اس تحریک کے وہی تھے۔

اور مقدمات انگریزی کی انتقامی کارروائیوں کی زندہ شہادت دے رہے ہیں۔ ان کی تفصیلات ہنٹر کی مشہور کتاب ” ہمارے ہندوستانی مسلمان “ (Our Indian Mussalmans) میں مذکور ہیں۔ اور فی الواقع یہ حیرت انگیز امر ہے کہ ہنٹر نے نہایت دیدہ دلیری سے اس کتاب میں اکاذیب و باطل کا ایک طومار جمع کر دیا ہے۔ یہاں موقع ہنٹر کے سفید جھوٹ کی قلعی کھولنے اور اس جماعت کے زریں کار ناموں کے بیان کرنے کا نہیں ہے کیوں کہ ہم اپنے موضوع سے بہت دور جا پڑیں گے۔ مگر قصہ مختصر انگریزوں کا انتہائی تشدد اس جماعت کی سرگرمیوں کو کم نہ کر سکا۔ بلکہ۔

تغزیر جرم عشق سے بے صرفہ محنت

بڑھتا ہے اور ذوق گناہ یاں سزا کے بعد

اور باوجود ہر قسم کے تشدد کے اس جماعت کی ہردلعزیزی بڑھتی رہی اور ہندوستان سے روپیہ اور آدمی برابر اسمت جاتے رہے۔ چنانچہ جب میرا تقارف مولوی ولی محمد صاحب مرحوم سے ہوا تو اس وقت وہ تقریباً پنجاب سے ایک لاکھ روپیہ سے زائد سالانہ جہاد کے لیے اسمت بھجواتے رہے اور سینکڑوں آدمی سالانہ ہجرت کر کے اسمت یا کسی اور اسلامی ملک میں جا کر آباد ہو جاتے تھے۔ مہاجر لڑکوں کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں۔ وہ نوجوان بھی اس جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر ترک وطن پر مجبور ہوئے تھے۔

لیکن افسوس کہ جب اس جماعت کی عنان اہل لوگوں کی بجائے نااہل لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی تو اس میں بھی فساد اور خسران کے جراثیم پرورش پانے لگے۔ اور گو ہندوستان کے لوگوں کو اصل واقعات کا علم نہ تھا لیکن مرکز کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔

فخلف من بعدہم حلف اصاعوا الصلوات واتبعوا الشهوات (مریم)

ان کے جانشین ایسے لوگ ہو گئے جنہوں نے اپنی نمازوں کو ضائع کر دیا اور

خواہشات نفسانی کی پیروی میں مہنک ہو کر مقصد سے دور ہو گئے۔

کے منظوق کے مطابق ایسے زبردست اسلاف کے جانشین نہایت نالائق اور

نا اہل لوگ بن گئے جنہوں نے عقیدت سے نا جائز فائدہ اٹھایا اور اس روپیہ کو جو

جہاد کے لئے بھیجا جاتا تھا اپنی عیش پرستیوں کے لئے برباد کرنا شروع کیا۔ چونکہ اس

جماعت کے سرحدی لیڈروں کی سرگرمیاں پچھلے پچاس سال میں نہایت ہی شرمناک

رہی ہیں اور وہ عام مشائخ اور پیروں کی طرح ہر قسم کے فریب اور جھوٹ سے

اپنی دکان کی رونق بڑھاتے رہے ہیں اور ہندستان کے نہایت مخلص آدمیوں کو

بھی اپنا آلہ کار بنانے سے نہیں چو کے (اور میں خود بھی ان کے فریب کا شکار

رہ چکا ہوں) اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ان کے پوست کندہ حالات بیان کروں

اور مجھے ان کے درمیان رہ کر جن حالات کا علم ہوا انہیں جماعت اہل حدیث اور

عام مسلم پبلک کے فائدے کے لئے بے نقاب کر دوں تاکہ لوگ آئندہ ان کی

دھوکہ بازیوں سے بچیں اور مسلمانوں کی تنظیم میں ان ٹھوکروں سے بچیں جن کی وجہ سے

جماعت مجاہدین اس درجہ بیکار ہو گئی۔ فی الحقیقت ان کی مثال بھی معمولی پیروں کی سی

ہو گئی جو گدی بنانے کے لئے ہر قسم کا جھوٹا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔

بیر میں پہنچ کر مجھے امیر المجاہدین امیر نعمت اللہ صاحب کی طرف سے دعوت

موصول ہوئی کہ میں ان کے صدر مقام میں ضرور آؤں، اور اس میں یہ بھی تھا کہ ایک

نہایت عمدہ مکان میرے لئے تیار ہے۔ مجھے بھی خاص مسرت محسوس ہو رہی تھی کہ

جس جماعت کے ساتھ میرا اتنا پرانا تعلق رہا ہے اس جماعت کو نہایت قریب سے

دیکھنے کا موقع ملے گا۔ اس پر یہ بھی خوشی تھی کہ اپنے سیاسی گرو مولوی ولی محمد صاحب

سے بھی جو ہجرت کر کے اسمت آچکے تھے شرفِ ملاقات ہوگا۔

مولوی ولی محمد صاحب مرحوم سے مجھے بے حد عقیدت تھی۔ ان کی زندگی سرتاپا جہاد تھی اس لئے میں مشتاق تھا کہ دیکھوں کہ مولوی صاحب اپنے صحیح ماحول میں پہنچ کر کیا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جب میں اسمت پہنچا تو خود امیر نعمت اللہ صاحب اور ان کے بھائی مولوی رحمت اللہ صاحب اور مولوی ولی محمد صاحب اور دیگر اراکین جماعت نے میرا پر خلوص خیر مقدم کیا۔ مجھے جلدان کی مسجد میں لے گئے جہاں تمام مجاہدین جمع تھے۔ جہاں امیر نعمت اللہ نے ایک مختصر مگر نہایت شستہ اردو میں تقریر کی اور میرا خیر مقدم کیا اور فرمایا کہ ہمیں مولوی صاحب کی ذات سے بہت زیادہ توقعات ہیں۔ یہ جماعت کے پرانے خادم ہیں اور اب ہمارے پاس آئے ہیں۔ امید ہے کہ ان کے مشوروں سے جماعت دن دوئی اور رات چوگنی ترقی کرے گی۔ میں نے مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ جلسہ برخواست ہوا۔ اور میں اپنے مکان میں چلا گیا۔ میرا مکان بسنی سے باہر مگر مسجد سے بالکل قریب تھا اور رات کے وقت بسنی کے پہرہ دار کی اقامت گاہ کے بالکل سامنے تھا۔ مکان میں ایک کمرہ۔ ایک باورچی خانہ، ایک پاخانہ، ایک غسل خانہ اور ایک اچھا خاصہ صحن تھا۔ اس کا محل وقوع نہایت پر فضا تھا۔ دامن کوہ میں واقع تھا اور عین اس کے نیچے کوئی دو سو گز کی اترا نی پر ایک خاصہ پڑا پھاڑی نالہ بزنڈو بہتا تھا۔ اس کا پانی نہایت شفاف شیریں اور ٹھنڈا تھا، اور ایسی تیزی سے بہتا تھا۔ کہ باوجودیکہ وہ زیادہ گہرا نہ تھا پھر بھی اسے عبور کرنا خاصا مشکل تھا، گو ہم لوگ اسے اکثر عبور کرتے رہتے تھے۔ بزنڈو میں مچھلیاں اس کثرت سے تھیں کہ مجاہدین کے لئے اچھا خاصا لحاظاً طریاً (تازہ گوشت) مہیا کرتی تھیں۔ میں نے اوپر مچھلی کے شکار کے متعلق جو لکھا ہے وہ اسی نالے کی مچھلیوں کے متعلق تھا۔ ہم اس میں اکثر مچھلی کا شکار کھیلتے۔ اس نالے کے پار

ایک نہایت سرسبز اور خوبصورت سلسلہ کوہ تھا جو دریائے سندھ کے کنارے
تک پھیلا ہوا تھا اس سلسلہ کوہ پر ایک نہایت خوبصورت اور دلفریب خودرو
قدرتی بنفشہ زار تھا جو بلا مبالغہ میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کھیت کو دیکھ کر
مجھے ہمیشہ بے انتہا فرحت ہوتی اور میں خواجہ حافظ کا مشہور شعر اکثر پڑھا کرتا تھا۔

گزار کن چو صبا بر بنفشہ زار و بہیں

کہ از قطا دل زلفت چہ سو گوارا نند

میں نے اکثر دیکھا کہ نسیم سحر جب چلتی تھی تو بنفشہ کے خوبصورت پھول اور اس
کی نرم نرم پتیاں جھومنے لگتیں شاید لسان الغیب نے اس نظارہ کو اپنے شعر میں
بیان کیا ہے۔ بنفشہ کے تازہ پھولوں کی چائے اس قدر خوش ذائقہ اور خوشبو دار
ہوتی ہے کہ معمولی چائے کی پیالی اس کی برابری نہیں کر سکتی۔ بنفشہ کی تازہ پتیوں کا لپ
میں نے رستے ہوئے داد (Wet Eczema) کے لئے بہت ہی مفید پایا۔

چاندنی رات میں بنفشہ زار اور بھی دلفریب معلوم دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔
کہ ایک بنفشی چادر ہے جو قدرت نے میدان میں بچھادی ہے ان پگڈنڈیوں میں
ہم نے اکثر چکور کو چاند کی طرف دیکھتے ہوئے اور اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے پایا۔
چکور بھی نہایت خوبصورت پرندہ ہے اور رات کے وقت اس کی صبا رفتاری گھوڑے
کو بھی مات کرتی تھی۔ اکثر قبائلی چکور کا نثار رات کے وقت کھیلتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ
اس کا راستہ متعین کر کے درمیان میں جال لگا دیتے ہیں۔ وہ رات کے وقت نکلتا
ہے اور چاند کو پکڑنے کے لئے دوڑتا شروع کرتا ہے۔ راستے میں جال میں پھنس کر
رہ جاتا ہے۔ اس طرح سے وہ لوگ ایک ایک جال میں کئی کئی چکور پکڑ لیتے ہیں۔ اس
کا گوشت بھی بہت لذیذ ہوتا ہے اور ہم اکثر اس کا گوشت کھایا کرتے تھے۔

برنڈو کی تیز رفتاری سے میں اکثر تعجب کیا کرتا کہ کتنا بڑا ذبیحہ بر قابی وقت

کا ضائع ہو رہا ہے۔ لیکن ایک دن میں اس کے کنارے کنارے چلا گیا تو معلوم ہوا کہ چند میل آگے جا کر وہ نالہ دریا کے سندھ میں گرتا ہے اور اتنی بڑی بلندی سے گرتا ہے کہ میلوں تک اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اتنی بڑی آبخار سے ہم جتنی بھی برقابی قوت حاصل کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ میں وہاں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ افسوس ہمیں قدرت نے کتنے خزانے دولت کے معنی عطا فرمائے ہیں، مگر ہماری لاعلمی اور دونہمیتی سے وہ ضائع ہو رہے ہیں۔ برٹنڈو کی آبخار اس زور سے دریا کے سندھ میں گرتی ہے کہ میلوں تک اس تیز رفتار دریا میں بھی اس کا دھارا بالکل الگ بہتا ہے اور مچھلیاں اس کے اوپر چڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ میں نے پہلی دفعہ وہاں اپنی عمر میں مچھلیوں کو آبخار کے اوپر چڑھتے ہوئے دیکھا تو معلوم ہوا کہ برٹنڈو میں مچھلیوں کی افزائش دراصل دریا کے سندھ کی مچھلیوں کی وجہ سے ہے۔

مسجد اور میرے مکان کے درمیان ایک سپاٹ قطعہ تھا جس کے ایک حصہ میں، میں نے مختلف سبزیاں بومی تھیں۔ کرلیے، بھنڈی، ترئی، ٹنڈے، کدو، اس کثرت سے ہوتے تھے کہ نہ صرف میں یا امیر نعمت اللہ صاحب بلکہ اکثر حجابین ان سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ تعجب ہے کہ مجھ سے پہلے کبھی کسی کو خیال نہ آیا تھا کہ اس کثرت سے سبزی بوئے یا سبزیاں بھی گوشت کے ساتھ پک سکتی ہیں۔ وہ لوگ مسور کی دال اور ٹکی کی روٹی کے اس قدر عادی تھے کہ کسی تبدیلی کا خیال بھی ان کے دل میں نہ آتا تھا۔

میں نے اپنے مکان میں رہائش اختیار کر لی تو اب پہلی دفعہ یہ خیال کیا کہ اب جماعتی کام جم کر کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے مجھ سے اکثر احباب نے کہا کہ میں باقاعدہ

بیعت کر کے جماعت مجاہدین کے سلسلہ میں شامل ہو جاؤں۔ اس سے پہلے ملا بشیر صاحب
مجھ سے اس کے متعلق کہہ چکے تھے، مگر میں نے اس بنا پر غدر کیا تھا کہ اگر میں امیر نعمت اللہ
صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا تو یاغستان کے بڑے بڑے ملا جو اب میری اس
درجہ عزت کرتے ہیں مجھ سے بدظن ہو جائیں گے اور یہ خیال کریں گے کہ میں امیر حبیب اللہ
کا نام لے کر درحقیقت امیر نعمت اللہ کا پروگنڈا کر کے لوگوں کو دہانی بنانا چاہتا
ہوں۔ ملا بشیر مرحوم نے میری بات کی تائید کی اور اس کے بعد انھوں نے کبھی اصرار نہ
کیا کہ میں جماعت میں داخل ہو جاؤں۔ لیکن ہر شخص ملا بشیر کی طرح ہوشمند نہیں ہوا
کرتا۔ چنانچہ جب میں اہمست پہنچا تو اکثر مجاہدین جو میرے وہاں پہنچتے ہی میرے بہت
بے تکلف دوست بن گئے تھے، اصرار پر اصرار کرنے لگے کہ میں باقاعدہ بیعت کر کے
جماعت میں داخل ہو جاؤں۔ اس کے لئے مجھ پر مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالا جاتا
رہا اور شرعی دلائل بھی دیئے گئے مگر میں ٹالتا ہی رہا۔ سب سے زیادہ زور میرے
محترم بزرگ اور رفیق کار مولوی ولی محمد صاحب نے (جن کا نام اب مولوی موسیٰ
رکھا گیا تھا اور آئندہ ہم انھیں اسی نام سے یاد کریں گے) مجھ پر دیا۔ انھوں نے
مجھے وہ مشہور حدیث سنائی۔

من مات وليس في عنقه رقبة طاعت الا ما عرف قد مات ميتة

الجاهلية (او کما قال)

”جو شخص مرا اور اس کی گردن میں کسی امیر کی اطاعت یعنی بیعت کا حلقہ

نہیں وہ جاہلیت یعنی کفر کی موت مرا“

اور تنبیہ کی کہ اگر میں بیعت کر کے داخل جماعت نہیں ہوں گا تو میری موت جاہلیت کی
موت ہوگی میں نے مختلف دلائل دئے کرا نہیں ٹالنا چاہا اور انھیں یقین دلایا کہ دراصل میں امیر حبیب اللہ
صاحب کی بیعت میں داخل ہوں اور ان کی طرف سے تمام ملاؤں سے بیعت جہاد

لے رہا ہوں اس لئے مجھے کسی دوسرے امیر سے بیعت کرنے کی ضرورت نہیں، مگر وہ میری ایک نہ سنئے تھے اور یہی کہتے تھے کہ میں جماعت کے فوائد سے تو متمتع ہونا چاہتا ہوں مگر اس کی شرعی پابندیوں سے اپنے نہیں آزاد رکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اسی وجہ سے مولوی موسیٰ صاحب مجھ سے ناراض رہتے تھے۔

میں نے امیر نعمت اللہ کے متعلق بہت سی روایات چمکنڈ میں بھی سن رکھی تھیں۔ اس لئے پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ جب تک اچھی طرح سے خود چھان بین نہیں کروں گا۔ "جماعت" میں شامل نہیں ہوں گا۔ وہاں جا کر میں نے دیکھا کہ حالات کہیں بدتر تھے۔ میں نے جو رپورٹیں سنی تھیں وہ غلط نہ تھیں۔ امیر نعمت اللہ اب وہاں پہنچ چکے ہیں جہاں وہ احکم الحاکمین کے حضور میں اپنے اعمال کی جوابدہی کر رہے ہیں، اس لئے ہماری نکتہ چینی سے اب وہ بے نیاز ہیں، لیکن پھر بھی ان کے پبلک اعمال کو بے نقاب کرنا اس لئے ضروری ہے تاکہ مسلمانوں کا یہ مزمن مرض یعنی پیرپرستی جو انھیں گھن کی طرح دکھاتا رہا ہے دور ہو اور وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ دنیا کس طرف جا رہی ہے اور وہ کیونکر مذہب کے دھوکے میں گنڈم نما جو فروش مشائخ کے پنجے میں گرفتار ہو کر تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ جماعت کے داخلے کے لئے تمام دلیلیں مذہبی دی جاتی تھیں اور وہ تقریباً وہی تھیں جو پیر و مشائخ اپنی دکانیں سجانے کے لئے اور مریدوں کا حلقہ ارادت وسیع کرنے کے لئے بیان کرتے ہیں۔

اول :- انسان کی انفرادی زندگی بھڑکریوں کی سی زندگی ہے۔ اس لئے اسلامی زندگی میں داخلہ کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے اس ماحول سے قطع تعلق کر کے نئی زندگی میں اسلامی آئیڈیلز لے کر داخل ہو اور ایسے ماحول میں آجائے جو سرتاپا اسلامی ہو۔

دوئم :- بیعت کرنے پر انسان تمام جماعتی حقوق کا وارث ہو جاتا ہے اور

اگرچہ جماعتی زندگی بہت سی پابندیاں سامنے لاتی ہے مگر اس سے جو فوائد مترتب ہوتے ہیں وہ ان پابندیوں کی تلافی کر دیتے ہیں۔

سو ہم بیعت کرتے وقت انسان کو اطاعتِ امیرِ رازواری، افرادِ جماعت کو بھائی اور تمام ان لوگوں کو جو جماعت سے باہر ہوں حقیر سمجھنے یا کم از کم اجنبی خیال کرنے کا عہد لیا جاتا تھا۔

اطاعتِ امیر کا مطلب یہ تھا کہ امیر کی ذات ہر قسم کی نکتہ چینی سے بالاتر خیال کی جائے اس کے عیوب کو حسنات سمجھا جائے اور اس کے خلاف کسی قسم کی بری بات اپنی زبان سے نہ نکالی جائے کیونکہ اطاعتِ امیر کے انکار سے فسخ بیعت لازم آتا ہے اور فسخ بیعت کفر اور الحاد کے برابر ہے۔ من شدّ شدّ فی الناس (جو کوئی جماعت سے اگک ہوا، آگ میں اکیلا ڈالا جائے گا) کی وعید ایسی سخت ہے کہ کوئی شخص امیر سے لاپرواہی نہیں برت سکتا۔ اس کو جہاں اس طرح پین کرتے ہیں کہ قیامت کے دن سب لوگ اپنے اپنے پیروں کے جھنڈے تلے اٹھائے جائیں گے۔ اس لیے جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی خوفِ خدا ہے وہ ایک دفعہ داخلِ بیعت ہو کر اپنے امیر یا پیر کی نکتہ چینی کرنا گناہِ عظیم خیال کرتا ہے۔ چنانچہ میں نے خود دیکھا ہے کہ اچھے اچھے پڑھے لکھے آدمی جب داخلِ جماعت ہو جاتے ہیں تو عقل و خرد اور ہوش و حواس کو خیر باد کہہ کر اپنے پیرِ طریقت یا امیرِ جماعت کی ہر مذموم سے مذموم فعل کی بھی تحسین یا بطریقِ تنزل توجیہ کر کے اپنے دل کی تسلی کر لیتے ہیں۔ اور حافظا کا یہ شعر پڑھتے ہیں۔

بہ مے سجادرہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید

کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسم منزل لہا

ان کے خیال کے مطابق جماعتی مفاد اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ ہر رکن

جماعت اپنا تنقیدی حق (Right of Criticism) استعمال کرے کیونکہ جماعتی مفاد کا ہر شخص کو علم نہیں ہو سکتا۔ صرف امیر جماعت یا شیخ طریقت ہی اس کو جان سکتا ہے یا جانتے کا حق دار ہے۔ باقی تمام ارکان کو امیر کی پیشخ کی اندھی پیروی کرنی چاہیے۔ جماعتی ڈسپلن کی مثال ان کے خیال میں نلٹری ڈسپلن کی سی ہے جس طرح میدان جنگ میں کسی سپاہی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے امیر یا کمانڈر کے حکم کی علت معلوم کئے بغیر اس کی تعمیل سے انکار کر دے۔ بلکہ ایسا کرنے والا غدار اور بھگوڑا مقصود رہوگا اور اس کا کورٹ مارشل کر کے اسے گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔ اسی طرح کسی جماعت کے رکن کو یہ حق حاصل نہیں کہ امیر کے حکم کے خلاف اعتراض کرے اور اس میں لا مجالہ امیر کی ذات بہر قسم کی تنقید سے بالاتر ٹھہرتی ہے۔ دوسری شق رازداری کی ہے۔ اس کی دلیل بھی قرآن حکیم سے دی جاتی ہے۔

وَإِذَا جَاءَ هُم مِّنَ الْأَمْنِ أَوْ الْخَوْفِ إِذْ أَعْوَابُهُمْ دُلُورِدُو

إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ تَعْلِمُهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ

مِنْهُمْ (النساء - ۶ - ع)

”اور جب ان لوگوں کو امن یا خوف کے متعلق کوئی بات معلوم ہوتی

ہے تو یہ اسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر یہ لوگ (اس خبر کو مشہور کرنے کی

جگہ) رسول کے یا اپنے ارباب اختیار کے حضور میں پیش کرتے تو وہ

لوگ جو ایسے امور کی چھان بین کرتے ہیں ان خبروں (کی حقیقت) تک

پہنچ جاتے۔“

میں یہاں اس آیت کے اصلی منطوق پر بحث نہیں کروں گا کیونکہ میرا مقصد صرف

ان لوگوں کی ذہنیت کا نقشہ پیش کرنا ہے۔ وہ لوگ کہتے تھے اور یقین کرتے تھے کہ

جماعتی زندگی کا اصل اصول یہی ہے کہ جو خبر بھی معلوم ہو اسے پہلے اپنے امیر کی خدمت

میں پیش کیا جائے۔ پھر امیر کی اجازت ہو تو کسی دوسرے سے اس کا ذکر کیا جاسکے۔ اب اس رازداری کے اصول کو دینی لباس میں وہ اس رنگ میں پیش کرتے تھے کہ جماعت کے اندرونی حالات کسی شخص کے سامنے جو جماعت سے باہر ہو ذکر نہ کئے جائیں۔ چنانچہ جو قاصد جماعت کے ہندوستان روپہ جمع کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ وہ یہاں خوب مبالغہ آمیز تصویر جماعت کے کارناموں کی بیان کرتے تھے۔ اس کا مقصد چندہ جمع کرنا تھا اور وہ قاصد صرف وہی باتیں بیان کرتے جو امیر حبیب اللہ ان سے کہہ دیتے تھے۔ چنانچہ ہتھیار خریدنے کے فرضی قصے انگریز کے خلاف معرکہ آرائیوں کی جھوٹی کہانیاں، خوب نمک مرچ لگا کر ہندوستانی عقیدت مندوں سے بیان کرتے اور ان سے خوب چندہ بٹورتے۔

تیسری شق یعنی اپنی جماعت کے افراد کو ہی صالح سمجھنا اور دوسرے سب مسلمانوں کو فاسق یا گمراہ خیال کرنا بھی درحقیقت اس جماعتی اتحاد کو قائم رکھنے کے لئے ہے۔ ان لوگوں کو ہر جہت کے خطبہ میں جماعت میں شمولیت کے متعلق احادیث سناسا کر لیں دلایا جاتا تھا کہ جو لوگ داخل جماعت نہیں وہ ورنا قص الامان ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ یہ تینوں امور ہر جماعت کا اتحاد اور نظم قائم کرنے کے لئے ضروری ہیں یہاں تک کہ موجودہ زمانہ کی کمیونسٹ پارٹی بھی اپنی اصولوں کو شعل راہ بنائے ہوئے ہے، لیکن جس طرح ان اصولوں پر ان جماعتوں میں عمل ہو رہا ہے اس سے نہ صرف حریت فکر حرف غلط کی طرح مٹ جاتی ہے بلکہ انفرادی عمل کی جگہ تقلید جامد جماعتی ارکان کے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہم نے پچھلی جنگ عظیم کے موقع پر کمیونسٹوں کی حریت فکر اور آزادی رائے کا ایک طرفہ تماشادیکھا۔ جنگ عظیم چھڑنے سے پہلے تمام کمیونسٹ لیڈریک زبان جرمن کو پانی پی پی کر گوستے تھے اور ان کی نظروں میں ہٹلر شیطان مجسم تھا۔ کوئی برائی ایسی نہ تھی جو اس میں نہ پائی جاتی ہو۔

لیکن جونہی اس کا اسٹالن سے معاہدہ ہو گیا اور وہ جنگ عظیم میں کود پڑا تو نہ صرف اسٹالن کے اس فعل کو تہہ تر اور دور اندیشی سے تعبیر کیا گیا بلکہ ہٹلر کی تعریفوں کے پل باندھ دیے گئے اور جرمن کے دشمنوں کو بوجہ اور دشمن انسانیت اور حریت کش و غیرہ کے الفاظ سے یاد کیا گیا، لیکن جونہی جرمن اور اسٹالن میں ٹھن گئی تو اب وہی اتحادی امن اور انسانیت کے دوست بن گئے اور اسٹالن تو جس طرح پہلے کمیونسٹوں کا ہیرو تھا ویسے ہی اس غداری اور وعدہ خلافی کے بعد بھی وہ ہیرو ہی رہا بلکہ اسکی غداری اور وعدہ خلافی کو اسکے انتہائی تدبیر کی شان قرار دیا گیا غرض ہر بات میں کمیونسٹ پارٹیاں اسٹالن کو گراموفون کا کام دیتی رہیں اور اب تک دے رہی ہیں۔ رازداری کو کمیونسٹ روس نے تو اس انتہا کو پہنچا دیا ہے کہ بائیس کرد ر نفوس ایک حاکم جماعت کے قیدی ہیں۔ نہ وہ باہر جاسکتے ہیں نہ کسی باہر کے آدمی سے مل سکتے ہیں۔ نہ ان کی مجال ہے کہ اسٹالن کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکیں کیونکہ اسٹالن کے خلاف ایک لفظ نکالنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ ایک آہنی حصار ہے جو روس کو گھیرے ہوئے ہے جس کے اندر نہ تو باہر کی کوئی آواز سرایت کر سکتی ہے نہ کوئی وہاں کی آواز باہر آسکتی ہے۔ یہاں تک کہ غیر ملکی سفرا بھی وہاں قیدیوں کی زندگی بسر کرتے ہیں جماعتی عصبيت کا یہ حال ہے کہ سوائے بوشویکوں کے۔ اور سب لوگوں کو بوجہ اور مادہ پرست، اخلاق باختہ، بے ایمان، جھوٹے، انسان کا گوشت پوست کھانے والے کہا جاتا ہے مجھے یاد ہے کہ ایک جلسے میں ایک بہت بڑے کمیونسٹ لیڈر نے امریکہ کے متعلق بعض اعداد و شمار پیش کئے اور اس سے سرمایہ داری نظام کی خرابیوں کے متعلق استدلال کیا۔ میں خود سرمایہ داری نظام کا یا امریکہ کا دلدادہ نہیں ہوں، لیکن اس کی غلط بیانی ایسی صاف تھی کہ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اعتراض کیا کہ آپ کے اعداد و شمار غلط ہیں اور میں نے ایک امریکن کتاب کا حوالہ دیا تو اس کے

جواب میں ہنسنا اور کہنے لگا کہ وہ بوجہ ابے ایمانوں کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے معاً کہا کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ بولشویکوں نے حق و صداقت کا اجارہ لے لیا ہے۔

فقہ مختصر، ان تینوں اصولوں پر اندھا دہندہ عمل کرنے سے جو خرابیاں کسی جماعتی نظام میں پیدا ہو سکتی ہیں وہ سب کی سب جماعت مجاہدین میں بدرجہ اتم موجود تھیں اور ابتدا میں جو جوش عمل اور دلولہ جہاد ان کو دوسروں سے ممتاز کرتا تھا۔ وہ مرد آہام سے اور بد عمل لیڈروں کی سیاہ کاریوں سے بالکل سرد ہو چکا تھا۔ اور اس کی جگہ تقلید جامہ، غلط توکل اور بیکار دینداری نے لے لی تھی۔

جماعت مجاہدین میں گو میرا قیام کچھ زیادہ طویل نہ تھا مگر اس مختصر سے قیام میں مجھے بہت قیمتی معلومات نہ صرف اس جماعت کے متعلق حاصل ہوئیں بلکہ انقلابی جماعتوں کے طریق کار کے متعلق ایک نئی بصیرت حاصل ہوئی۔ سب سے پہلے تو یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ جماعت مجاہدین کی تاسیس ایسے مبارک ہاتھوں سے ہوئی جن کے پیش نظر اسلام کے احیاء کے سوا اور کوئی دنیوی مقصد نہ تھا۔ ہنٹر اور دوسرے متعصب انگریز مورخوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت سید احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تحریک محض سکھوں کی بیخ کنی کے لئے اٹھی تھی، لیکن یہ بالکل غلط اور خلاف واقع ہے اور اس غرض کے لئے انہوں نے حضرت سید صاحب کی تحریرات کو مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ جماعت مجاہدین کے مرکز میں ایک بہت قیمتی مسودہ تھا جو حضرت شاہ اسماعیل صاحب کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ یہ ان تمام خطوط کی نقول پر مشتمل تھا جو حضرت سید احمد صاحب شہید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وقتاً فوقتاً شاہان اسلام کو لکھے تھے۔ جن میں انھیں اپنی تحریک انقلاب میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ ان تحریروں میں

حضرت سید صاحب نے اپنی تحریک کی غرض و غامضت اور اسلام کے دشمنوں کی دسیہ کاریوں پر روشنی ڈالی تھی اور قیام دین کے مقدس فریضہ کی طرف انھیں بلا یا تھا۔ وہ تمام تحریرات اس قابل ہیں کہ انھیں بجنسہ شائع کر دیا جائے اور میں نے امیر نعمت اللہ صاحب سے بہت کہا کہ وہ اس مسودہ کو میرے حوالے کر دیں۔ تاکہ میں انھیں شائع کروا سکوں مگر انھوں نے یہی کہا کہ یہ جماعت کا مبارک ورثہ ہے اسے میں جدا نہیں کر سکتا اور دوسرے انگریز انھیں دیکھ کر فی الفور ضبط کر لے گا اور تلف کرادے گا کیونکہ ان سے اس کے اکا ذیب و ابا طیل کا تار و پود بکھرتا تھا میں نے ان تحریروں کو بار بار پڑھا کیونکہ بمصداق۔

ہوالمشاک ما کررہ یقنوع

(وہ مشاک کی طرح ہے کہ جتنا اسے سونگھو اتنا ہی زیادہ خوشبو دیتی ہے) اس لئے جہاں تک میرا حافظہ میری یادری کرتا ہے میں ان کا خلاصہ بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ ایک طرف ان بد بخت انگریز مصنفین کے جھوٹ کا پول کھل جائے گا دوسری طرف مولوی عبید اللہ سندھی مرحوم کے غلط پروپیگنڈا کی حقیقت بھی ظاہر ہو جائے گی۔

حضرت سید صاحب نے ان تحریروں میں سب سے پہلے تو اس وقت کی اسلامی سلطنتوں کے انحطاط کی تصویر کھینچی ہے اور لکھا ہے کہ اگر یہی حالت چندے رہی تو یہ

اے مولانا عبید اللہ سندھی نے "شاہ دن اللہ کے سیاسی افکار" میں حضرت سید احمد صاحب شہید اور ان کی تحریک کے متعلق بہت سی بے سرو پا باتیں لکھ دی ہیں جن کی اشاعت ایسے عالم دین کے قلم سے نہایت افسوسناک ہے۔ دراصل مولانا سندھی کے یہ افکار بھی انگریزی زہریلے پروپیگنڈا کا نتیجہ ہیں۔ اس کتاب کی تردید مولوی مسعود عالم ندوی نے کی ہے۔

رہی ہے اسلامی حکومتیں بھی حرف غلط کی طرح مٹ جائیں گی۔ انہوں نے ان کے
 اس تنزل و انحطاط کی اصل علت اسلام کے زریں اصولوں سے انحراف کو قرار
 دیا ہے اور ان کے اخلاقی تسفل کو اس کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے
 مسلمان بادشاہوں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کی ہے کہ اسلام دشمنوں کی
 وسیعہ کاریوں سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ ان کمزور بات سے انہوں نے اس امر کی
 بار بار وضاحت کی ہے کہ اس وقت دنیا میں اسلام کا سب سے زیادہ مکار اور
 خوفناک دشمن انگریز ہے جو ہندوستان کی اسلامی سلطنت کو مٹا کر وہاں غاصب
 کفر کی حکومت قائم کرنی چاہتا ہے۔ اس لئے وہ لکھتے ہیں کہ خدا نے اپنے ایک مومن
 بندے (میداحمد) کے قلب میں یہ القا کیا ہے کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا وقت
 آن پہنچا ہے اور اس کی ابتدا اقامت دین کے مقدس فریضہ سے ہونی چاہیے۔ اقامت
 دین کا مطلب یہ ہے کہ خود مسلمانوں کو اسلامی شعار اور تعلیمات کا پابند بنانے کی کوشش
 کی جائے تاکہ وہ کذب اور جھوٹ، رشوت ستانی، خویش پروری، اقربا لواری،
 ملت زدگی، غداروں کے مہلک امراض سے نجات پا کر نئے سرے سے متحد ہو کر
 انگریزوں کو ہندستان سے نکال کر وہاں خلافت علی منہاج النہوۃ قائم کریں اور
 فرقہ پرستی سے بالاتر ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر ہندوستان کو تمام دنیا میں
 اعلیٰ کلمۃ اللہ کے لئے ایک مرکزی اور قابل تقلید نقطہ (اسکے) فوکس
 (Focus) بنائیں تاکہ اسلام کی شعائیں وہاں سے نکل نکل کر تمام دنیا کو منور
 کریں اور دنیا میں اسلام کا بول بالا ہو کہ امن، اخوت، مساوات، اور جمہوریت کا
 دور دورہ ہو۔

انگریز کے اثر و نفوذ کے متعلق حضرت سید صاحب نے نہایت بصیرت افروز
 مقالات تحریر کئے ہیں۔ وہ انہیں اسلام کا سخت ترین دشمن قرار دیتے ہیں اور

لکھتے ہیں کہ انگریز کی ریشہ دوانیوں نے تمام اسلامی ممالک کو اختیار کا غلام بنا دیا ہے اس لئے ہر انقلابی مسلمان کا فرض ہے کہ وہ انگریز کے خلاف ہر سہرے پیکار میں اور اس کی ابتدا ہندوستان سے انگریز کو خارج کرنے اور ہند میں اسلامی سلطنت قائم کرنے سے ہونی چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر انگریز کو ہندوستان سے نکال دیا جائے تو سب اسلامی ممالک کی آزادی کا راستہ صاف ہو جائے گا۔ انگریزی حکومت کا تختہ پلٹنے کے بعد حضرت سید احمد صاحب نے اسلام کے احیاء اور نشر و اشاعت کا ایک مفصل پروگرام پیش کیا جس کا نچوڑ یہ تھا کہ مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنایا جائے اور انہیں خود غرض، طامع، لالچی، بے ایمان رہنماؤں اور بادشاہوں کے پنجے سے نجات دلائی جائے تاکہ وہ دنیا کو اسلام کی برکتوں سے متمتع کر سکیں۔

سید صاحب نے ہر بدعت اور بد اخلاقی کے خلاف اعلان جہاد کیا۔ مسلمانوں کے مزمن، فرقہ پرستی کے خلاف انہوں نے علم بغاوت بلند کیا اور تمام مختلف فرقوں کو دعوت دی کہ۔

ما انا علیہ واصحابی" جس پر میں اور میرے رفقا گامزن ہیں" سے تمسک کریں۔ انہوں نے حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی فرقوں میں اعتدال کی راہ تجویز کی کہ جس امام کا مسلک کسی خاص مسئلے میں کتاب و سنت کے قریب تر ہو اسی کو اختیار کر لیا جائے۔ چنانچہ باوجودیکہ وہ حنفی تھے لیکن بہت سے مسائل میں حنفی مسلک سے

لے۔ اس میں ایک طویل حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں مختلف فرقے ہو جائیں گے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ایسے وقت میں ہم کیا کریں۔ فرمایا کہ اس راستہ پر چلو جس پر میں اور میرے رفقا گامزن ہیں۔

انحراف کر کے سنت کے مطابق یا کسی دوسرے مجتہد کے اجتہاد کے مطابق فتویٰ
 دیتے تھے اور اس مسلک کو انھوں نے مسلک احمدیت کے نام سے موسوم
 فرمایا۔ مثلاً رفع یدین اور آمین یا لہجر کے متعلق حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ
 کا مشہور فتویٰ حضرت سید صاحب کے مسلک اعتدال کا آئینہ دار ہے۔
 لیکن حضرت سید احمد صاحب کے مکاتیب کا وہ حصہ جس میں وہ برٹش امپیریلزم
 کو بے نقاب کرتے ہیں اہم ترین ہے اور اسے دیکھ کر ان کی زبردست سیاسی بصیرت
 اور علم تاریخ سے آگاہی کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے صاف کہا کہ برٹش امپیریلزم کا
 مقصد اسلام کو تباہ کرنا اور صلیبی لڑائیوں کی شکست کا بدلہ لینا ہے اور اس غرض
 کے لئے وہ آہستہ آہستہ تمام اسلامی ممالک کو مضمحل کرنا جائے گا۔ وہ برٹش امپیریلزم
 کو خالص، جرمنی اور روس سے زیادہ خوفناک دشمن خیال کرتے تھے۔ انھوں
 نے جو کچھ اپنے مکاتیب میں تحریر فرمایا اور برٹش امپیریلزم کے غزائم کے متعلق جو کچھ
 لکھا وہ ان کی شہادت کے بعد حرفاً حرفاً پورا ہوا اور ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں
 کہ مشرق میں سلطان میو شہید کے بعد برٹش امپیریلزم کا حضرت سید احمد صاحب سے
 بڑا دشمن پیدا ہی نہیں ہوا۔ اسی لئے برٹش گورنمنٹ نے بھی اپنے اس دشمن کے خلاف
 ہر قسم کے حربے استعمال کیے۔ اجیر مولویوں کو رکھ کر جھوٹا پروپیگنڈا کر دانا،
 جاسوسی کے ذریعے ان کے آدمیوں کو قتل کروانا، امیر افغانستان کو رشوت
 دیکر حضرت سید صاحب کے خلاف غدیر پر آمادہ کرنا، سکھوں کو ان کے خلاف
 ہر قسم کی کمک دے کر تیار کرنا ان کے پرفزیب پروگرام کا ادنیٰ کرشمہ تھے۔ ان کی
 تفصیل کے لئے کسی بڑے مورخ کا قلم درکار ہے۔ قصہ مختصر۔ حضرت سید احمد صاحب
 کی بے وقت شہادت نے ان کی ساری اسکیم کو بے کار کر دیا۔ ان کے جانشینوں
 نے ایک مدت تک ان کے مشن کو چلایا اور ہندوستان اور بیرون ہند میں انگریزی

اسفار کے خلاف نہایت منظم کام کیا، مگر کچھ عرصے کے بعد ان کے ایسے جانشین آگئے جنہوں نے دنیاوی منفعت کو دینی خدمت پر ترجیح دی اور جب میں پہنچا تو اس جماعت کی عنان اقتدار امیر نعمت اللہ کے ہاتھوں میں تھی۔

امیر نعمت اللہ مرحوم ایک بھاری بھر کم خوبصورت و جید دراز قامت نوجوان تھے۔ گفتگو میں نہایت شائستہ متین اور سنجیدہ تھے۔ بڑے زیرک اور مردم شناس آدمی تھے۔ ان کے خطبات کافی دلنشین ہوتے تھے۔ خوبصورت ترشی ہوئی ڈاڑھی، سر پر خوبصورت ستھرے پٹے رکھتے تھے۔ لباس میں پٹنہ اور یوپی کا قدیم غوارہ اور لمبا کرتہ، نگہ دار صوری پہنتے تھے۔ سر پر عمامہ اور ہاتھ میں نفیس پھڑی۔ مسلمان امرا و مشائخ کی طرح عورٹوں کے بے حد شوقین تھے۔ میں تو ان کی نکاحتا بیویاں نہیں اور دس بارہ نہایت خوبصورت لڑکیاں بطور خادماؤں کے رکھتے تھے۔ امیر صیب اللہ خاں کی طرح امیر نعمت اللہ کا بھی زیادہ وقت انہی نوجوان لڑکیوں سے اپنا دلچسپی میں گزارنا تھا۔ جماعت مجاہدین میں یہ قاعدہ تھا کہ خلفائے راشدین کی طرح امیر جماعت نماز میں امامت کے فرائض بھی ادا کرتا تھا۔ مگر امیر نعمت اللہ نے جہاد کی مصروفیتوں کا عذر کر کے ایک اور حافظ صاحب کو اپنی جگہ امام مقرر کر رکھا تھا۔ بعض اوقات امیر صاحب اذان کے بعد فوراً تشریف لے آتے تو وہ امامت کے فرائض انجام دیتے ورنہ بالعموم وہی حافظ صاحب امامت کر داتے اور امیر صاحب کبھی کبھار مسجد میں تشریف لاکر ترکیب جماعت ہو جانے اور ایک بندوق بردار پہرہ دار سنگین چڑھائے ہوئے ان کے پیچھے حفاظت کے لئے کھڑا رہتا تھا۔ جب نماز ختم ہو چکتی تو امیر صاحب واپس تشریف لے جاتے اور پہرہ دار انھیں زناخانہ میں پہنچا کر واپس آکر نماز ادا کرتا۔

جماعت مجاہدین کی قیام گاہ ایک کچے قلعہ کی صورت میں تھی۔ ایک مرتب

دیوار قلعہ کی فصیل کی طرح اس تمام بستی کے ارد گرد بنی ہوئی تھی۔ اس میں چاروں
 کولوں پر دمے بنے ہوئے تھے۔ جن میں بندوق بردار بوقت ضرورت بیٹھ کر
 بستی کی حفاظت کر سکتے تھے۔ بستی کا ایک بڑا دروازہ تھا جو رات کو بند کر دیا جاتا تھا۔
 اور اس پر رات کو بندوق کا پہرہ رہتا تھا۔ دروازے سے داخل ہونے ہی دائیں جانب
 مکانات تھے۔ بیچ میں اچھا خاصہ صحن تھا اور صحن کی دوسری طرف دروازے کے
 بالمقابل امیر المجاہدین کی اقامت گاہ تھی۔ اس عمارت میں مجاہدین کا بیت المال تھا
 جس کی کنجی امیر صاحب کے پاس رہتی تھی۔ کسی شخص کو بیت المال کے متعلق امیر صاحب
 سے سوال کرنے کا حق نہ تھا۔ میں نے سنا کہ بعض گستاخوں نے بیت المال کے متعلق
 سوال کرنے کی جسارت کی مگر اس کا جواب یہ ملتا کہ رات کو چپکے سے امیر صاحب کے
 معتمد انھیں ختم کر دیتے تھے اور پھر اس کا ذکر بھی کوئی شخص نہ کر سکتا تھا۔ امیر صاحب
 کے دولت کدہ کے ارد گرد مجاہدین کے مکانات تھے۔ شادی شدہ لوگوں کے کوارٹرز
 تھے اور غیر شادی شدہ لوگوں کے لئے بیرکیں تھیں۔ امیر صاحب کے ارد گرد ان کے
 خاص انخاص معتمدین کے مکانات تھے۔ دروازے کے متصل دو منزلہ مکانات بھی
 تھے جن میں امیر صاحب کے بھائی امیر رحمت اللہ اور ان کے حواری فرزند تھے۔
 جماعت کا ایک مرکزی لشکر تھا جس میں نہایت ردی خوراک روزانہ دولوں
 وقت مجاہدین میں تقسیم ہوتی تھی۔ خوراک میں عام طور پر کئی کا آٹا، بیماروں کے لئے
 گہوں کا آٹا، مسور کی دال جسے تیل سے بھارا جاتا تھا، عیال دار اور مجرد دولوں
 وقت اپنے اپنے برتن لے کر لشکر خانے میں پہنچ جاتے اور اپنے حصے کا کھانا
 لے کر آجاتے تھے۔ ان میں اکثر لڑکوں کی قناعت جیرت انگیز تھی کہ کیونکہ اس درجہ
 ردی غذا پر صبر و شکر سے قناعت کئے بیٹھے رہتے تھے۔ غذا کی خرابی کی وجہ سے اکثر
 مجاہدین سب کھانے کا شکار امشب استخوان، نہایت دہلے اور منحنی لوگ تھے۔

بعض لوگ علاحدہ اپنا کام کرتے تھے اور وہ اپنے کھانے وغیرہ کا الگ انتظام کرتے تھے، لیکن ان لوگوں کے علاوہ ایک خاص حلقہ ان لوگوں کا تھا جو امیر صاحب کے حوالی موالی تھے۔ انہیں اپنی خدمات کے صلے میں امیر صاحب ہمیشہ داد و دہش سے نوازتے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ تو امیر صاحب کے جاں نثار خدام میں سے تھے جو امیر صاحب کے ادنیٰ اشارے پر ہر قسم کے جرائم کرنے پر آمادہ و تیار رہتے تھے، مثلاً اگر امیر صاحب کی خادماؤں میں سے کوئی لڑکی حاملہ ہو جائے تو اس کے بچے کو پیدائش کے بعد گلا گھونٹ کے چپے سے نہریا برد کر دینا امیر صاحب کی عادت تھی کہ ان خادماؤں کو اکثر بدلتے رہتے تھے جو خادماؤں اس طرح الگ کی جاتی تھیں ان کی شادیاں انہی لوگوں میں سے کسی ایک سے کر دی جاتی تھی اور اسے نہایت عمدہ جہیز اور ماہوار خرچ مل جاتا تھا اور یہ امر اس درجہ افسوس ناک تھا کہ ان میں سے جو لڑکی غیر معمولی طور پر خوبصورت ہوتی وہ شادی کے بعد بھی امیر صاحب کی توجہات کا مرکز بنی رہتی تھی۔

امیر نعمت اللہ کے بعد ان کے برادر امیر رحمت اللہ جماعت میں صاحب اثر و رسوخ تھے، مگر چوں کہ بیت المال امیر نعمت اللہ کے قبضہ میں تھا اس لئے شخص امیر صاحب کی نظر عنایت کا محتاج تھا ورنہ فاقہ کشی سے اس کا خاتمہ یقینی تھا۔ امیر نعمت اللہ نے اس قدر ہوشیاری سے اپنا جال بچھا رکھا تھا کہ کوئی شخص ان کے سامنے دم نہ مار سکتا تھا۔ رحمت اللہ بھی اپنے بھائی کی طرح بہت بدچلن اور آوارہ مزاج نوجوان تھے۔ اگر امیر نعمت اللہ کو لڑکیوں کی رغبت نے معطل کر رکھا تھا، تو انہیں نوجوان لڑکیوں کی محبت نے دنیا دماغیہا سے بے خبر بنا رکھا تھا۔ کبھی کبھار انہیں روپیہ کی ضرورت ہوتی اور امیر نعمت اللہ کہیں اکا رکھ دیتے تو بس جماعت کے احاطہ میں ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ رحمت اپنے بڑے بھائی کو خوب مغلطات سناتے اور روپیہ لے کر ہی ملتے۔ ہم لوگ ان لڑکیوں سے تنگ آچکے تھے، مگر

کیا کرتے ہیں نے کئی دفعہ امیر صاحب سے کہا کہ رحمت اللہ کا خاص وظیفہ مقرر کر دیجئے مگر وہ کہتے کہ رحمت اللہ او باس ہے کوئی وظیفہ اس کی روز افزوں ضروریات کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم یہ محض بہانہ تھا یا اس میں واقعیت کا بھی کچھ شائبہ تھا۔

امیر نعمت اللہ کی اولاد نرینہ میں سے سب سے بڑا لڑکا برکت اللہ تھا۔ جو غالباً اس وقت نو سال کا تھا۔ لڑکا خاصاً خوب صورت اور بگڑا ہوا صاحب زادہ تھا۔ ہر وقت دو تین او باس نوجوان اس کی مصاحبت میں رہتے، اس لئے اس کا آوارہ ہونا لابدی تھا۔ میں نے بسا اوقات اس کے والد پر زور دیا کہ برکت اللہ کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیں کیونکہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے مسلمان امرا کے بچے زیور تعلیم سے آراستہ ہوں۔ قیصر ولیم کے شہزادوں کے واقعات اور پرس آف ویلز (سابق کنگ ایڈورڈ ہشتم) کے واقعات سنا سنا کر انھیں غیرت دلاتا کہ کفار امرا کے بیٹے تو ایسے ماحول میں پرورش پائیں اور ہمارے امرا کے چشم و چراغ کی اٹھان ایسی بری ہو، مگر امیر صاحب پر کچھ اس کا اثر نہ ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔

جماعت کے بااثر حضرات میں سے امیر نعمت اللہ کے بعد ملا بشیر (مولوی عبدالرحیم) تھے۔ ان کا ذکر میں تفصیل سے کر آیا ہوں۔ ملا بشیر واقعی جہت انگیز شخص تھے۔ سلف صالح کے سچے جانشین، ان تھک کارکن، مجسم عمل، ایثار کا پیکر بے غرض، صحیح معنوں میں انقلابی لیڈر تھے۔ انھیں دیکھ کر اقبال کا مشہور شعر یاد آتا تھا۔

یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

امیر حبیب اللہ خاں صاحب نے ان کے کام سے خوش ہو کر ان کا

ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ وہ اس میں قوت لایوت رکھ لیتے (غالباً پانچ روپیہ ماہوار) اور باقی سب بیت المال میں اسلحہ کے لئے جمع کر دیتے تھے۔ ان کا اثر تمام یاغستان میں بے نظیر تھا۔ ہر قبیلہ کے ملک اور شیوخ ان کی بے حد عزت کرتے تھے اور حق تو یہ ہے کہ ان کی وجہ سے امیر نعمت اللہ کا تمام علاقے میں خاصاً و قارئاً قائم ہو گیا تھا۔

جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں جوں جوں ہمارا کام قبائلی علاقہ میں ترقی کر رہا تھا۔ ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کی وار و گیر ہمارے کارکنوں کے خلاف زیادہ سخت ہوتی جا رہی تھی۔ چنانچہ اس کا سب سے پہلا وار مولوی ولی محمد صاحب پر ہوا۔ والد صاحب قبل مرحوم و مغفور کو اس کا علم ہو گیا۔ انھوں نے مولوی صاحب کو بروقت متنبہ کر دیا۔ اس پر مولوی صاحب نے ایک سو پنجابی مجاہدین سمیت ہجرت کی اور اسمت چلے گئے۔ ہمیں ان کے آجائے سے بہت مسرت ہوئی کہ ایک عمدہ رفیق کار آ گیا اور ان کے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے جماعت کی اصلاح میں کوشش کریں گے۔ اسمت میں امیر نعمت اللہ نے ان کی خوب آؤ بھگت کی اور ان سے بیعت لے کر جماعت میں داخل کر لیا۔ بد قسمتی سے اسمت میں آکر پنجابی اور بنگالی کا سوال پیدا ہو گیا۔ بنگالیوں میں حد درجہ کی صوبائی عصیت ہے۔ اس کی بنا پر انھوں نے پنجابیوں کے خلاف ایچی ٹیشن کرنا شروع کر دیا۔ ہم نے اس نازک صورت حالات کی بنا پر امیر نعمت اللہ سے منظوری لی کہ یہ پنجابی جماعت چمکنڈ میں مقیم ہو جائے۔ چنانچہ میں چمکنڈ میں ہی اس جماعت کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ یہ پنجابی جماعت حقیقی معنوں میں مجاہد اور انقلاب کے لئے بے تاب تھی۔ مولوی ولی محمد صاحب نے جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں اپنا نام محمد موسیٰ رکھا اور آئندہ ہم انھیں محمد موسیٰ کے نام سے ہی یاد کریں گے۔ امیر نعمت اللہ نے مولوی محمد موسیٰ کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے پہلے

ان کی شادی ایک خوبصورت لڑکی سے کر دی۔ اس کے چند ماہ بعد ایک دوسری خوبصورت لڑکی سے ان کی شادی کر دی۔ اب ان کی دو بیویاں ہو گئیں۔ جب میں پہنچا تو ان کی چھوٹی بیوی کے ہاں ایک لڑکا بھی تولد ہو چکا تھا اور مولوی صاحب اب پورے متناہل ہو گئے تھے۔ امیر نعمت اللہ نے ان کے لئے خاصا معقول وظیفہ مقرر کر دیا تھا اور وہ بظاہر ان کے سلوک سے بہت خوش تھے۔ یوں بھی امیر نعمت اللہ ان کی بے انتہا عزت کرتے تھے اور اپنے تمام مشوروں میں انہیں شریک کرتے تھے۔ جب مولوی محمد موسیٰ صاحب اسمت پہنچے تو میں چمرکنڈ میں تھا۔ مجھے ان کی آمد سے بہت خوشی ہوئی تھی کیونکہ مجھے خیال تھا کہ ان کا قیام جماعت مجاہدین کی اصلاح میں مدد دے گا۔ مجھے یقین تھا کہ جس شخص نے پنجاب میں ایک آگ سی لگا دی تھی اور گاؤں گاؤں میں انگریز کی مخالفت کا بیج بویا تھا وہ بالضرور جماعت مجاہدین کی کایا پلٹنے میں کامیاب ہوگا۔ چنانچہ میرے اسمت جانے کے کئی حرکات میں سے ایک بہت بڑا محرک ان سے ملاقات بھی تھا کہ ان سے تبادلہ خیالات کر کے اپنے دیرینہ پروگرام کی تکمیل میں ان سے مدد لوں گا۔ چنانچہ اسمت پہنچ کر اولین فرصت میں میں نے انہیں اپنے گھر بلایا۔ ملا بشیر صاحب موجود تھے اور ہم تینوں کی بہت دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ مولوی صاحب نے سب سے پہلے تو امیر نعمت اللہ کے خلاف شرکایت کا ایک طومار پیش کیا۔ ان کی بدعنوانیاں، ان کا عورتوں کے ساتھ شغف، ان کی جہاد سے غفلت و اعراض۔ جماعتی فنڈ کو اپنے اغراض مشورہ کی تکمیل کے لئے بے دریغ استعمال کرنا سب پیش کیے اور کہا کہ مجھے تو شرم آتی ہے کہ میں پنجاب میں اس شخص کے متعلق اتنا جھوٹا پروپیگنڈا کرتا رہا اور لوگوں کو جماعت کے فرضی کارناموں کی داستانوں سے اپنی طرف مائل کرتا رہا۔ یہاں آکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں پنجاب میں حالت خواب

میں تھا اور اب آنکھیں کھلی ہیں تو ایک بھیانک منظر سامنے ہے۔ جماعت مجاہدین اخلاقی طور پر مرچکی ہے۔ اس کی عملی قوتیں فنا ہو چکی ہیں۔ اس کے دو حصے ہیں۔ ایک تو خوش حال طبقہ جو امیر مجاہدین کے متوسلین پر مشتمل ہے۔ وہ لوگ نہایت سخت ادب باشہد چلن اور خود غرض ہیں۔ انھیں تو صرف اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ دوسرا طبقہ عام لوگوں کا ہے جو بالکل جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انھیں قوت لایوت بھی مشکل سے میسر آتا ہے۔ تیل کی بگھاری ہوئی مسور کی دال اور مکا یا جو ارکی روٹی ان کی غذا ہے۔ ان لوگوں کو مذہب کی ایفون پلما کر خواب خرگوش میں مبتلا کر دیا گیا ہے اور وہ اپنی اس زندگی پر بھی بے انتہا شاداں ہیں ان کو یہ بتلایا گیا ہے کہ حضرت سید احمد صاحب شہید نہیں ہوئے بلکہ عین لڑائی کے دوران میں ان کا رفع الی السماء ہوا اور اب وہ واپس تشریف لانے والے ہیں۔ یہی مجاہدین ان کے اصحاب صفہ بنیں گے اور وہ پھر ہندوستان کو فتح کریں گے۔ مولوی صاحب نے صاف کہا کہ میرا توجی چاہتا ہے کہ میں ہندوستان ہی میں مارا جاتا اور یہاں نہ آتا کیونکہ یہاں آکر میرا اپنا ایمان منزلزل ہو رہا ہے کہ کیا مذہب اسی کا نام ہے۔ میں تو یہاں آکر کچھ پیار باہوں۔ امیر المجاہدین نے کمال ہوشیاری سے میری دوشاردیاں کر دی ہیں دونوں خوبصورت اور جوان ہیں اور ہر طرح سے نہایت اچھی بیویاں ہیں اور اب مجھے اس دنیاوی زندگی سے ان کی بدولت اتنی دلچسپی ہو گئی ہے کہ امیر المجاہدین کے خلاف لب نہیں بلا سکتا کیونکہ یہ شخص ایسا بے اصول ہے کہ جو شخص ذرا بھی بغاوت کا میدان ظاہر کرتا ہے اسے فی الفور قتل کروادیتا ہے اور مجھے یہ رنج ہوتا ہے کہ میں اگر اس طرح قتل ہو جاؤں گا تو میری بیوی بچے کیا کریں گے اور شیخ سعیدی کا یہ شعر پڑھا۔

اگر دنیا نباشد درد مندیم وگر باشد بہ ہوش پائے بندیم

مجھے انہوں نے بہت زور سے کہا کہ میں کسی اصلاح کا خیال بھی ظاہر نہ کروں ورنہ
 امیر المجاہدین مجھے بلا تامل قتل کروادیں گے۔ میں نے ان کے سامنے امیر حبیب اللہ
 کی غداری کی داستان دہرائی اور کہا کہ ہماری تمام اکیم کامیاب ہوتے ہوئے
 محض امیر حبیب اللہ خاں کی بزدلی اور عیش دوستی کی وجہ سے ناکام ہو رہی ہے۔
 اب ضرورت ہے کہ اس کے لئے کوئی نیا سربراہ تلاش کیا جائے جس پر تمام
 قبائلوں کا اتفاق ہو سکے۔ انہوں نے کہا کہ امیر المجاہدین سے اس امر کی توقع
 فضول ہے۔ تھہر محض وہ بہت مایوس تھے۔ انہوں نے صاف کہا کہ انقلاب کی
 ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ امیر حبیب اللہ خاں اور امیر نعمت اللہ دونوں کو
 قتل کر دیا جائے اور ان کی جگہ ایک پر زور لیڈر شپ قائم کی جائے۔ مگر انہوں
 نے صاف کہہ دیا کہ میں خود کسی ایسی تحریک میں شامل ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں
 مگر ہم پر بھی ایسا نژدہ مسلط نہ تھا جسے مولوی محمد موسیٰ صاحب کی ترشی اتار سکتی۔
 امیر المجاہدین کے ایک میرنشی تھے جو ہمارے قصور کے بہت بڑے رئیس
 تھے۔ ان کا اصل نام تو مولوی ولی اللہ تھا مگر اختیاری نام مولوی عبدالواسع تھا۔
 مولوی عبدالواسع قصور کے ایک معمولی آدمی تھے۔ مگر اپنی ذاتی قابلیت کی بدولت
 ریاست فریدکوٹ میں میرنشی ہو گئے اور دولت مند بن گئے۔ جب راجہ فوت
 ہو گیا اور اس کا نابالغ بیٹا گدی پر بیٹھا تو سرکار انگلشیہ نے ایک کونسل آف
 ریجنی مقرر کی جس میں وہ بہ حیثیت ایک رکن کے مقرر ہوئے اور ان کا منصب وزیر
 مقرر ہوا۔ راجہ کے سن بلوغ تک تو انہوں نے خوب دبدبہ سے حکومت کی۔ لیکن راجہ
 کے عنان اقتدار سنبھالتے ہی ان کے اقبال کا ستارہ غروب ہوتا شروع ہوا۔
 راجہ نے گدی سنبھالتے ہی سب سے پہلے کونسل آف ریجنی کے ممبروں پر ہاتھ
 صاف کرنا شروع کیا۔ مولوی عبدالواسع صاحب بھی مقدمے میں دھرے گئے

اور جس طرح ریاستوں میں اندھیرا گری ہوتی تھی وہ ایک ہی دن میں چار سال کے لئے
 قید کر دیے گئے۔ والد صاحب قبلہ مرحوم و مغفور نے بمشکل تمام انہیں ضمانت پر رہا کر دیا
 اور وہ راتوں رات ریاست سے مفور ہو کر حضرت والد صاحب کی وساطت سے
 اسمت پہنچا دیے گئے۔ وہ نہایت اعلیٰ درجہ کے خوش نویس تھے اور فارسی پر ایسی
 قدرت تھی کہ ان کے مکتوبات ابوالفضل کے انشا کی یاد تازہ کرتے تھے۔ مجھے اچھی
 طرح سے یاد ہے کہ جب میں کابل میں تھا اور ان کے مراسلے امیر حبیب اللہ کی خدمت
 میں پہنچتے تھے تو وہ انہیں مکرر سہ کر رہا کرتے تھے اور مولوی صاحب کی اعلیٰ
 فارسی انشاء کی داد دیتے اور ان کی خوش خطی کی تعریف کرتے۔ کابل میں اس زمانہ میں
 کوئی شخص ایسا نہ تھا جو فارسی میں ان کی ہم سہی کر سکتا۔ وہ ایک بوڑھے پرانے خیال
 کے بزرگ تھے۔ ہر قسم کی سیاسی اور انقلابی کاموں سے الگ تہلگ رہ کر امیر
 نعمت اللہ کی حاشیہ برداری میں اپنی عمر کے بقیہ دن گزار دینا چاہتے تھے۔ میرے
 ان کے چونکہ قدیمی مراسم تھے اور میرا بچپن ایک طرح سے ان کی گود میں بسر ہوا تھا۔
 اس لئے وہ مجھ سے بے انتہا محبت فرماتے تھے اور کبھی کبھی علاحدگی میں مجھے نصیحت
 کیا کرتے کہ تمام انقلابی خیالات سے تائب ہو کر امیر نعمت اللہ کے مصاحب کے طور پر
 آرام سے اپنی زندگی بسر کروں۔ بالکل وہ بہت ہی مرعبان مریخ اور صلح کل شخص تھے۔
 امیر المجاہدین ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور ہر طرح سے ان کے آرام اور
 آسائش کا خیال رکھتے تھے۔ ایک نوکر کھانا پکانے کے لئے اور تمام رسد اور
 جیب خرچ ان کو ملتا تھا اور وہ بہت خوش رہتے تھے۔ کبھی کبھی اپنی ریاست
 اور وزارت کو یاد کر کے آب دیدہ ہو جاتے مگر بالعموم وہ راضی برضا رہتے تھے۔
 اور امیر صاحب کی تعریف میں رطب اللسان۔

جماعت مجاہدین کی مثال اب ایک گلستانِ خزاں منظر کی تھی۔ وہ اخلاقی لحاظ سے مردہ ہو چکی تھی اور اس کی انقلابی روح بالکل سرد ہو چکی تھی یا اس کی مثال ایسے جسد بے جان کی سی تھی جو طرح طرح کی ملمع کاریوں کی وجہ سے دور سے جاندار معلوم دیتا ہوئے دیکھ کر کبھی یہ یقین نہ ہوتا تھا کہ یہ وہ جماعت ہے جس کے اسلاف کے خون سے بالا کوٹ کی سر زمین لالہ زار بنی یا جس کی اقامت دین کی انتھک مساعی سے پشاوڑ اور ہزارہ کے اضلاع کے جمود میں حرکت پیدا ہوئی۔ اللہ اکبر! جس جماعت کے اسلاف نے ہندستان میں اسلامی قربانی و ایثار کی ایسی شاندار مثالیں پیش کی تھیں جن پر انسانیت اور حریت ابد الابد تک فخر کریں گی، اس کی اب یہ حالت تھی کہ ان کی عظمت گزشتہ کا نشان تک بھی اس میں باقی نہ تھا۔ اس جماعت میں یہود کی طرح یا شیعہ حضرات کی طرح یہ عقیدہ پرورش پا چکا تھا۔ کہ اب ان پر جہاد فرض نہیں۔ سید احمد صاحب دوبارہ ظاہر ہو کر تلوار کو بے نیام کریں گے اور انگریز کو ہندستان سے نکال کر خلافت علیٰ منہاج المبنوۃ قائم کریں گے۔

اجتماعی نفسیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب قوموں کو انتہائی ہزیمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بظاہر حالات اُمید بالکل منقطع ہو جاتی ہے تو وہ ایک موموم امید کے سہارے زندہ رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔ چنانچہ یہود کا سیج کی آمد کا منتظر رہنا اور سیج کی آمد کے لئے دست بدعا رہنا تاریخی حقیقت ہے اسی طرح شیعہ حضرات کا صدیوں تک غارِ ستر من رائی کے دہانے پر جا کر امامِ غائب مہدی آخر الزماں کے ظہور کی دعائیں کرنا معلوم عوام ہے۔ اس قبیل سے جماعت مجاہدین کو جب انتہائی ہزیمت اٹھانی پڑی اور ان کی کوئی اسکیم بظاہر کامیاب نہ ہوئی تو لوگوں میں سید احمد صاحب کے ظہور ثانی کا عقیدہ نشوونما پانے لگا حضرت سید احمد صاحب کی شخصیت جو براہِ راست مشکوٰۃ بنوۃ سے مستیری ایسی

حیرت انگیز تھی اور ان سے ایسے مجرا عقول کا رنلے سرزد ہوئے کہ عام لوگوں کے خیال میں یہ بات آہی نہیں سکتی تھی کہ وہ اپنے مشن میں ناکام بھی ہو سکتے تھے چنانچہ جب حضرت سید احمد صاحب اور ان کے رفقاء کئے کرام پٹھانوں کی غداری سے ہری سنگھ قلوئے کے ہاتھوں بالا کوٹ میں شہید ہوئے تو راسخ العقیدہ مسلمانوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ حضرت سید صاحب شہید نہیں ہوئے بلکہ غائب ہو گئے ہیں۔ اور ایک مناسب و موزوں موقع پر دوبارہ تشریف لائیں گے۔ چنانچہ جماعت مجاہدین کے اکثر راسخ العقیدہ لوگوں کو یہ یقین تھا کہ حضرت سید صاحب دوبارہ تشریف لائیں گے اور اس جہان کو الحاد و زندقہ اور کفر و شیعتیت سے پاک کریں گے چنانچہ مجاہدین کی جماعت میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا موجود تھا جو نہایت متدین تھے۔ اور نہایت خشوع و خضوع سے ہر وقت یہ دعا کرتے تھے کہ خدایا! ہمارا ابتلا کا دور ختم ہو اور سید صاحب دوبارہ تشریف لائیں۔ چنانچہ جب میں پہنچا تو کئی راسخ العقیدہ مسلمانوں نے مجھ سے اپنے رویا بیان کیے کہ حضرت سید صاحب ان کے خواب میں تشریف لائے ہیں اور فرما گئے ہیں کہ ہم اب ظاہر ہونے والے ہیں۔ ایسے خوابوں کی کثرت سے اشاعت کی جاتی تھی اور حکمراں طبقہ کی طرف سے ان کے ذریعہ ہندستان اور یاغستان کے جہال کے حُسن ظن سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی جاتی تھی۔ وہ لوگ دیانتداری سے یہ سمجھتے تھے کہ جب تک حضرت سید احمد صاحب تشریف نہ لائیں گے اس وقت تک جہاد کی تیاری کرنا فضول تھا حضرت سید صاحب کے ساتھ فرشتوں کا ایک جُرار لشکر ہوگا اور فتح و نصرت ان کی رکاب تھا مے ہوں گی۔ میں آگے چل کر لکھوں گا کہ کیونکر میں نے اس فاسد عقیدہ کے خلاف جہاد کیا اور مسلمانوں کو واعدوا لہم ما استنطعم من قوۃ

”اور مسلمانوں! کفار کے مقابلے کے نئے اہمیاں تک تم سے ہو سکے قوت پیدا کرو اور گھوڑوں کی چھاؤنیاں بناؤ“ کے معنی سمجھانے کی کوشش کی۔ فی الحال جماعت کے نظم و نسق اور طریق کار پر روشنی ڈالنی چاہتا ہوں۔

گو جماعت مجاہدین کا مرکز مردہ ہو چکا تھا مگر اس کے پروپیگنڈا کا نظام ابھی تک بہت وسیع اور عمدہ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سیدھے سادے مسلمان جنہیں کتاب و سنت کے ساتھ عشق ہوتا تھا اس پروپیگنڈا کا آسانی سے شکار ہوتے تھے مسلمانوں میں اکثر لوگ حسن ظن کا شکار ہیں۔ یہ دنیا دار لوگ پیروں کے طلسم باطل میں گرفتار ہیں اور دیندار مجاہدین کے لوگ جماعت مجاہدین کے معتقد ہیں۔ قادیانی جماعت یا شیعہ مذہب کے فروع کی اصل وجہ بھی مسلمانوں کا یہی اندھا عقیدہ اور حسن ظن ہے۔ شیعہ مذہب میں بالخصوص آغا خانی جماعت اس کی نہایت عمدہ مثال پیش کرتی ہے کہ اگرچہ مرکز میں اخلاقی روح باقی نہ ہو مگر پھر بھی منظم پروپیگنڈا کیونکہ ہزاروں خوش عقیدہ مذہبی خیال کے آدمیوں کو جماعت سے وابستہ کئے رکھتا ہے۔ خیر جماعت مجاہدین کے موسسین نے شروع سے جماعت کے قیام و بقا کے لئے ایسا منظم سسٹم بنایا تھا کہ انگریزوں کا تشدد اور غدیر کے مقدمات بھی اس نظام کو توڑ نہ سکے۔ چنانچہ ہندوستان میں جگہ جگہ مختلف ادارے تھے جو بظاہر تعلیمی مشاغل میں منہمک تھے اور مدرسوں کے اور خیراتی اداروں کے ذریعے کافی رقم جمع کرتے تھے۔ اس رقم کا ایک معتد بہ حصہ سرحد پار امیر المجاہدین کے پاس جہاد کے لئے پہنچ جاتا تھا۔ ہندوستان میں مولوی ولی محمد جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں کہ مولوی محمد احمد میاں صاحب مرحوم مولوی فضل الہی صاحب مرحوم والد صاحب قبلہ پنجاب میں نہایت مستعدی سے کام کرتے تھے۔ پٹنہ اور بہار میں مولانا عبدالعزیز رحیم تر باگری، حافظ عبداللہ تریپوری، ڈاکٹر فرید، حافظ محمد صدیق وغیر

رتلام اور بمبئی میں حافظ عبدالغفور مدراس میں کا کا عمر صاحب وغیرہم اپنے اپنے حلقوں میں بہت مفید کام کرتے تھے اور خاموشی سے مجاہدین کا پروگنڈا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی سینکڑوں کارکن تھے جو شب و روز عبارت کی طرح جہاد کے پروپیگنڈا میں مصروف رہتے تھے دہلی میں پنجابی اہل حدیث کی جماعت، کلکتہ میں کپڑے اور لوہے کے مسلمان اہل حدیث ہو کر سب ہی اس مبارک کام میں شرکت کرتے تھے۔ مگر درحقیقت یہ سب لوگ ایک دوسرے سے کچھ زیادہ باخبر نہ تھے۔ ان کو ملانے والے وہ قاصد تھے جو اسمت سے آئے تھے اور امیر المجاہدین کے پیغامات ان تک پہنچاتے رہتے تھے۔ ان قاصدوں میں سے دو تین قاصد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عبدالقادر عبداللہ، عبدالرحمن وغیرہم کے نام جماعت مجاہدین کی خدمت کے باعث زندہ جاوید بن چکے ہیں۔

یہ قاصد نہایت ہوشیار، زیرک اور مصد علیہ تھے۔ ان کی رازداری دیانت و امانت اپنی آپ مثال تھی۔ وہ بہر و پ بھرنے میں استاد، اپنا حلیہ بدلنے میں مشاق تھے۔ سی۔ آئی۔ ڈی۔ اور اسپیشل پولس ہر وقت ان کے تعاقب میں رہتی تھی لیکن یہ انھیں دھوکا دینے اور بچنے اور روپیہ اور پیغامات صحیح سلامت اسمت تک پہنچانے میں شراک ہو کر کہا نیوں کی یاد تازہ کرتے تھے۔ بالعموم یہ لوگ ہری پور، ہزارہ یا پشاور سے ہندستان میں داخل ہوتے تھے اور پنجاب، دہلی، پوپی، بہار، کلکتہ سی۔ پی، رتلام، بمبئی، بنگلور اور مدراس کے چکر لگا کر تمام جمع شدہ رقوم اکٹھی کر کے مجاہدین کے لئے نئے رنگرڈ ساتھ لے کر واپس سالمًا غانمًا اسمت پہنچ جاتے تھے۔ یہ قاصد ایسے سخت رازدار ہوتے تھے کہ کبھی ان کی تعداد جو وہ ہندستان سے لاتے تھے جماعت کے کسی فرد کو معلوم نہ ہو سکتی تھی۔ وہ پولیس کو دھوکہ دینے سے لئے عجیب طرح سے بھیس بدلتے تھے۔ کبھی یورپین، کبھی کالج کے

طالب علم، کبھی سرحد کے رئیس زادہ کے لباس میں وہ سفر کرتے تھے، اور ہینٹی پر سر رکھ کر جماعت کا کام کرتے تھے۔ ان لوگوں کی حیرت انگیز جان بازی، ان کے اعلیٰ کیریئر ہندستانی مراکز کو مرعوب کرنے کے لئے کافی تھے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ باوجود اس قدر امین اور بے غرض ہونے کے وہ جماعت کے لئے حیرت انگیز جھوٹا پروپیگنڈا کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسان اضداد کا پتلا ہے۔ یہ تضاد میں نے اکثر بہترین کمیونسٹ ورکروں میں بھی دیکھا ہے اور مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک بے غرض ایثار کا پتلا، امین و دیانت دار شخص کیوں کر ایسی جماعت کے لئے بے دریغ جھوٹا پروپیگنڈا کرنے سے نہیں جھجکتا۔ بلکہ اسے عین ثواب سمجھ کر کرتا ہے۔ شاید شیخ سعدی نے ایسے ہی لوگوں کے حق میں کہا ہو کہ۔

دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز

میری پوزیشن بھی جماعت میں عجیب تھی۔ میں رسماً اس کا رکن نہ تھا۔ کیوں کہ میں نے باقاعدہ بیعت نہ کی تھی لیکن اثر و رسوخ کے اعتبار سے میں جماعت کے بہترین کارکنوں میں سے تھا۔ امیر اہمت اللہ ہر مشورہ میں مجھے شریک کرتے بلکہ میری تحریک پر بہت سی اصلاحات بھی نافذ کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ جمعہ کا خطبہ بھی اکثر میں ہی دیتا اور باوجود میری صاف گوئی کے امیر صاحب کبھی مجھ سے کبیدہ خاطر نہ ہوتے۔ تمام مجاہدین کو بہت جلد اس امر کا احساس ہو گیا کہ میں ان کا حقیقی معنوں میں خیر خواہ ہوں۔ میرے اثر و رسوخ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب سے میں جماعت میں آیا تھا امیر صاحب کے قاصد میرا نام لے کر خوب پروپیگنڈا کرتے تھے کہ ہندوستان پر اب حملہ ہونے والا ہے۔ اس لئے لوگ دل کھول کر چندہ دیتے۔ چنانچہ بہت کافی مقدار روپیہ کی میری وجہ سے پہنچنا شروع ہوئی۔ ہر قاصد جو ہندوستان سے آتا ضرور وہاں سے یہ پیغام لاتا کہ مولوی سلیمان کے

مشورے سے کام لیجئے۔ اس لئے قاصد بھی مجھ سے بے حد مانوس ہو گئے تھے اور اکثر اوقات مجھے ہندستان کے تمام حالات بتلا دیتے تھے۔ ان قاصدوں میں سے عبدالقادر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وہ ہمیشہ میرے پیغامات ہندستان کے اکثر لیڈروں کے پاس لے جاتے۔ چنانچہ میری ان کی وساطت سے حضرت مولانا محمود الحسن مرحوم کے بعض خاص شاگردوں سے، حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم و معذور مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر مرحوم، جھنڈو (اڑہ) تک رسائی تھی اور میرا ان سے باقاعدہ نامہ و پیغام انہی کی وساطت سے جاری رہتا اور اکثر اسکے ان کے مشورے سے طے ہوتی تھیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ عبدالقادر ہندستان کا چکر کاٹ کر ہری پور (ہزارہ) کے راستے اسمت جا رہا تھا اور در بند پہنچ کر وہ دریائے سندھ کے پار کرنے کو تھا کہ گورہ سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ گرفتار کر کے اس کا کوٹ اتار کر رکھ لیا اور اسے حوالات میں قید کر دیا۔ کوٹ میں بہت سا نقد روپیہ نوٹوں کی شکل میں تھا۔ اور روپیہ سے زیادہ ضروری خطوط تھے جو وہ ہندستان سے میرے نام لارہا تھا۔ وہ خطوط اگر گورنمنٹ انگریز کے ہاتھ لگا جاتے تو ہندستان کے اکثر نامور لیڈروں پر سازش کا مقدمہ چل جاتا اور انہیں تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ اور عصر کا وقت تھا کہ مجھے اطلاع ملی کہ عبدالقادر گرفتار ہو گیا ہے اور گوروں کی حوالات میں مجبوس ہے۔ اس حوالات پر چار گوروں کا پہرہ ہے اور دوسری صبح اس کا کورٹ مارشل ہو گا۔ مجھے یہ بھی اطلاع مل گئی کہ اس کا کوٹ جس میں روپے اور نہایت ضروری خطوط تھے گوروں نے اتار کر اپنے قبضہ میں کر لیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مجھے اس خبر سے شدید صدمہ ہوا کیونکہ میری آنکھوں کے سامنے ایک اور مقدمہ سازش کا نقشہ کھینچنے لگا جس میں ہندستان کے بڑے بڑے

سرکردہ لیڈر گرفتار ہو کر پھانسی کی سزا پائیں گے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ افطار کے وقت کی دعا مسترد نہیں ہوتی۔ چنانچہ میں نے افطار کے وقت نہایت گڑ گڑا کر خدا کے حضور دعا کی کہ عبد القادر کو نجات دے۔ پھر عشا کی نماز کے بعد اور نماز تراویح کے بعد نماز تہجد کے بعد اور پھر صبح کی نماز کے بعد دعا مانگا کریں وہیں مسجد میں لیٹ گیا اور میری آنکھ لگ گئی۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ عبد القادر آ کر میرے پاؤں دبار ہا ہے۔ میں جبران اس سے پوچھتا ہوں کہ میں عبد القادر رتم کیسے آگئے۔ اس نے کہا کہ میں تہجد کے وقت حوالات میں تھا اور گوروں کا پہرہ تھا کہ اچانک ایک خضر صورت بزرگ شریف لائے ان کے چہرے پر تولیہ پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے آتے ہی حوالات کا تالا کھولا اور میرا کوٹ مجھے دے کر کہا کہ اس میں تمہارا روپیہ اور کاغذات بھی موجود ہیں۔ چاروں بندر (یعنی کہ وہ پہرہ دار) سو رہے ہیں تم چپکے سے نکل جاؤ اور پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔ یہاں سے نکال دینا میرا کام تھا۔ اب بھاگ جانا تمہارا کام ہے۔ چنانچہ میں دریا کے کنارے آیا کشتی کھڑی تھی۔ میں بیٹھ گیا اور پار ہو گیا اور بھاگ کر یہاں آ گیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مشکل میرا خواب ختم ہوا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص میرے پاؤں دبار ہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو عبد القادر موجود تھا اور وہی میرے پاؤں دبار ہا تھا۔ میں نے اس سے اپنا خواب بیان کیا۔ اس نے قسم کھا کر بیان کیا کہ بالکل ویسا ہی معاملہ ہوا ہے۔ میں حوالات میں نماز تہجد کے لئے اٹھا کہ ایک نہایت بزرگ صورت شخص جیل کے دروازہ پر آئے۔ انہوں نے تالا کھولا۔ میں نے نہیں دیکھا کہ ان کے پاس چابی تھی یا نہیں یا بغیر چابی کے ان کے اشارے سے تالا کھل گیا۔ کوٹ ان کے پاس تھا جس میں میرے روپے اور کاغذات بجنسہ موجود تھے۔ کوٹ

مجھے دے کر کہا کہ خدا کا شکر کرو۔ تمہاری مخلصی کا سامان اس نے پیدا کر دیا ہے۔ یہاں سے نکال دینا میرا کام تھا، اب بھاگ جانا تمہارا کام ہے۔ مجھے مڑ کر نہ دیکھنا۔ انگریزی حکومت کے لئے عبدالقادر کا اس طرح نکل جانا بہت ہی حیران کن تھا کہ ایک نہایت مفید شکار ہاتھ میں آکر صاف نکل گیا۔ چنانچہ بعد میں مجھے صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم سے معلوم ہوا کہ اس واقعہ کا گورنمنٹ نے نہایت سخت نوٹس لیا اور ان پہرہ دار گوروں کا کورٹ مارشل ہوا۔ لیکن اس خبر کی اشاعت سے بالارادہ احتراز کیا گیا کیونکہ اس میں سرکار انگریزی کے حکام کی بسکی تھی اور لوگوں کو ان کی غفلت پر ہنسنے کا موقع ملتا۔

فقد محقر۔ انگریزی حکومت کی انتہائی کوششوں کے باوجود ہمارا پروٹیکٹڈ ہندستان میں پوری قوت سے ہوتا رہا اور گرامیر حبیب اللہ اور امیر نعمت اللہ کی زبردستی ہمارے آڑے نہ آتی تو ہم ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے۔ مجھے اس وقت رہ رہ کر کارلائل کا مقولہ یاد آتا کہ دنیا کی تاریخ بنانے میں ہیروز کا بہت بڑا دخل ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ہیروز ورشپ میں یہی نظریہ پیش کیا ہے۔ میرا اپنا تجربہ بھی یہی ہے کہ انقلابی تحریکوں کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار زیادہ تر ان کے لیڈروں کی قابلیت پر ہوتا ہے ورنہ نہایت مساعد حالات کے باوجود بھی ناکامی لیدر ایک تحریک کو برابر دیکھتے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ جیسے مساعد حالات ہمیں میسر آئے تھے وہ شاید ہی بیک وقت کسی انقلابی تحریک کو میسر آئے ہوں، مگر ہم نے جن لیڈروں کے ماتحت کام کیا وہ دونوں کے دونوں بخت نالائق، نااہل، خود غرض، ناکارہ اور جڑھیں تھے۔ اسی لئے ہماری تحریک ناکام ہو گئی۔

گر مجھے امیر حبیب اللہ خاں مرحوم اور امیر نعمت اللہ مرحوم سے کامل

باپوسی ہو چکی تھی لیکن پھر بھی میں نے اور میرے ساتھیوں نے ہمت نہ ہاری اور
 ہاتھ پیریا رتے ہی رہے۔ چنانچہ میں نے اہمت میں بچوں کے لئے ایک مدرسہ
 جاری کیا۔ مجاہدین میں یہ پہلی کوشش تھی ان میں تعلیم پھیلانے کی۔ چنانچہ ایک شخص
 عبدالجبار نے اپنی خدمات مجھے پیش کیں کہ وہ میرا کھانا پکا دیا کرے گا بشرطیکہ میں
 اسے مشکوٰۃ المصابیح پڑھا دوں۔ چنانچہ میں نے یہ معاہدہ کر لیا اور امیر نعمت اللہ
 صاحب سے اس کی منظوری لے لی۔ عبدالجبار امیر صاحب کا خاص آدمی تھا اور
 اس سے بعد میں مجھے امیر صاحب کے بہت سے پوست کندہ حالات معلوم ہوئے۔
 درحقیقت امیر صیب اللہ خاں اور امیر نعمت اللہ کی سب سے بڑی کمزوری عورتوں
 کی رغبت تھی اور اب بھی اگر دیدہ عبرت سے دیکھا جائے تو ہمارے مسلمان بادشاہوں
 اور روسا کی سب سے بڑی کمزوری یہی صنفِ نازک کی رغبت ہے۔ چنانچہ ہم سب
 نے مل کر یہ طے کیا کہ بیرونی دشمن کے خلاف ہم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہم
 اندرونی دشمنوں کے خلاف جہاد نہ کریں۔ اسی لئے حدیث شریفہ میں آیا ہے
 "افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر"

سب سے بہتر جہاد جابر سلطان کے خلاف سچی بات کہنا ہے (

اسلام کی سب سے بڑی کمزوری یہی اندرونی دشمن ہیں اور ہماری کھپلی تار مینج
 کے اوراق انھیں بد بخت غداروں کی خود غرضی، ملت فری، ہوس جاہ و زر کی
 المناک داستانوں سے سیاہ ہیں۔

لیکن اس اندرونی انقلاب کے لئے ہمیں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا
 پڑا۔ کیونکہ بد قسمتی سے ہمیں مسلمانوں کے کیر کٹر کا بہت تلخ تجربہ ہوا، اور سچ تو یہ ہے
 کہ مسلمانوں میں قوی کیر کٹر تو شاید پیدا ہی نہیں ہوا، اور نہ سیاسی شعور پیدا ہوا ہے۔
 افغانستان میں ہم نے محدودے چند ممتاز ہستیوں کے علاوہ بہت کم لوگوں کو

دیانتدار اور امین پایا۔ وہاں کے اکثر زعماء دو طرفہ جاسوس تھے، یعنی امیر صاحب تک ہر ایک بات کو پہنچانا اور انگریز سفیر مقیم کابل کو بھی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات پہنچانا ان کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔ اس لئے ہمیں بہت ہی پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑا۔ ہر شخص کو انگریزی اور افغان جاسوس سمجھ کر کام کرنا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں امیر حبیب اللہ یا امیر نعمت اللہ کے خلاف انقلاب برپا کرنا کس قدر کٹھن کام تھا۔ مگر ہماری مساعی جاری رہیں مگر افسوس ہے کہ امیر حبیب اللہ اور امیر نعمت اللہ دونوں بعد از وقت قتل ہوئے ورنہ اگر وہ ایک سال پہلے قتل ہو جاتے تو ہماری تحریک پوری کامیاب ہو جاتی اور امیر نصر اللہ خاں دہرادور امیر حبیب اللہ خاں، ضرور ہندستان پر حملہ کر دیتے اور جنگ کے آخری ایام میں یہ حملہ بہت فیصلہ کن ثابت ہوتا۔

گئے تھے داد پانے جن سے ہم کچھ خستہ حالی کی

وہ ہم سے بھی زیادہ کشتہ تیغ ستم نکلے

یاغستان میں کام شروع کرنے کے ساتھ ساتھ ہم نے بیرونی ممالک سے رابطہ پیدا کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ اس بارے میں ہمیں جرمن کمیشن کے ہیڈ ڈاکٹر فان ہینیک سے جن کا ذکر ہم کابل کے ضمن میں کر آئے ہیں بہت مدد ملی۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ہم جرمن گورنمنٹ سے منسک ہو جائیں۔ تو ہمیں ہتھیار اور پیسہ جلد اور کافی مقدار میں پہنچ سکے گا۔ چنانچہ ہم نے دو تین دفعہ کوشش کی مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ پہلی دفعہ ایک سکھ ڈاکٹر جو بنگال کی دہشت پسند جماعت کے رکن تھے اور جن کے خلاف انگریزی حکومت نے دفعہ ۱۲۱ کے تحت وارنٹ جاری کر رکھے تھے ہندستان سے فرار ہو کر میرے پاس کابل میں ہی

پہنچ گئے تھے اور چونکہ وہ منگل کے دن ہمارے پاس پہنچے اس لئے ہم نے ان کا نام
 ڈاکٹر منگل سنگھ رکھ دیا تھا۔ جب میں یا غستان پہنچا تو وہ بھی میرے پاس پہنچ گئے۔
 فان ہینگ کے مشورے سے یہ تجویز ہوئی کہ ڈاکٹر منگل سنگھ ایران کے راستے ترکی
 اور جرمنی جائیں اور ان دونوں سلطنتوں کے ساتھ ہمارا رابطہ قائم کریں۔ ان کے
 ساتھ دو اور مہاجر لڑکے لائے گئے۔ ڈاکٹر منگل سنگھ نہایت نڈر اور جری کارکن تھے۔
 کئی دفعہ وہ جرمنی جانے سے پہلے ہندستان ہو کر آئے تھے۔ وہ درانہ سکھوں کے
 ہاں چلے جاتے اور روپیہ وغیرہ لے کر واپس آجاتے ہندوستان کے اکثر ہندو لیڈروں کے ساتھ
 میزائامہ و پیام انہی کی وساطت سے ہوتا تھا۔ جب انھیں کہا گیا کہ برلن جاؤ تو
 وہ نہایت خوشی سے تیار ہو گئے۔ مگر افسوس کہ وہ ایران میں گرفتار ہو گئے۔ ان کے
 ساتھی تو بھیس بدل کر نکل گئے مگر وہ بیچ نہ سکے چنانچہ روسی سپاہیوں نے انھیں انگریزی
 سپاہیوں کے حوالے کر دیا وہاں سے وہ ہندستان لائے گئے اور پنجاب ہائی کورٹ
 میں۔ ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا۔ ایک انگریز جج اس مقدمہ کی سماعت کے
 لئے مقرر کیا گیا۔ جب استغاثہ کی شہادت ختم ہوئی تو جج نے کہا ڈاکٹر کیا تم کچھ
 کہنا چاہتے ہو؟ اس شیر مرد نے کہا کہ میں اپنے ڈیفنس میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔
 کیونکہ میں انگریزوں کو غاصب اور ظالم یقین کرتا ہوں۔ ہندستان ہمارا ہے اور ہم
 میں سے ہر ایک سچے ہندی کا فرض ہے کہ انگریز کے خلاف جہاد کرے اور انھیں
 ہندوستان سے نکال کر دم لے۔ لیکن مسٹر جج میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ جس طرح آج
 میں باغیوں کے کھڑے میں کھڑا ہوں اسی طرح ایک دن آنے والا ہے جب میرے
 ہم قوم جج ہوں گے اور آپ کے ہم قوم مجرموں کے کھڑے میں کھڑے ہوں گے
 اور ان سے ان کی سیاہ کاریوں کی جواب طلبی کی جائیگی۔ آپ کے جی میں جو آئے مجھے
 سزا دیجئے۔ مگر خدا کی عدالت کا دروازہ بھی کھلا ہے۔ جہاں آپ سب کو اپنے جرائم

کی سزا بگلتی پڑے گی۔ جج نے ڈاکٹر منگل سنگھ کو پھانسی کی سزا دی۔ فیصلہ سن کر ڈاکٹر
 مسکرایا اور کہا کہ میری آخری تمنا پوری ہوئی اور میں اپنے ملک پر جان دے رہا
 ہوں۔ چنانچہ فیصلہ کے دن سے پھانسی کے وقت تک اس بہادر مرد کا کوئی بارہ
 پونڈ وزن بڑھ گیا۔ جس دن ڈاکٹر منگل سنگھ کو پھانسی کی سزا دی گئی اس دن ان
 سے پوچھا گیا کہ آپ کی آخری خواہش کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ میری آخری خواہش
 یہ ہے کہ میری موت انگریزی کفن میں آخری کیل ثابت ہو۔

سرمائیکل اوڈو اور جو اس زمانے میں پنجاب کے گورنر تھے، ہماری تحریک کے
 سخت ترین دشمنوں میں سے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک تقریر کے دوران میں کہا کہ
 ”مجھے بہت خوشی ہے کہ سرکار کے دو بدترین دشمنوں میں سے ایک کو پھانسی کی
 سزا مل چکی ہے اور وہ ختم ہو چکا ہے۔ دوسرا دشمن (یعنی محمد علی راقم الحروف)
 پہاڑوں میں بھاگا پھرتا ہے۔ مگر اسے معلوم نہیں کہ سرکار انگریزی کا ہاتھ بہت
 لمبا اور مضبوط ہے۔ جس طرح ہم نے اس کے رفیق ڈاکٹر منگل سنگھ کو پکڑ کر
 موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اسی طرح اسے بھی گرفتار کر کے تختہ دار پر لٹکائیں
 گے تاکہ سرکار کے دشمنوں کے لئے تازیانہ عبرت ہو۔“ اس کے بعد سرمائیکل اوڈو اور
 سر جارج راس کیپل گورنر صوبہ سرحد، صاحبزادہ عبدالقیوم پولیٹکل ایجنٹ پشاور
 و خیبر نے اٹری چوٹی کا زور لگایا کہ کسی طرح مجھے پکڑیں اور پھانسی دیں، مگر خدا
 کی مہربانی سے میں ان کے شر سے محفوظ ہی رہا۔

دوسری دفعہ ہم نے شیخ محمد ابراہیم صاحب مرحوم کو جو میرے ساتھ جیبیہ کالج
 کابل میں تاریخ کے پروفیسر تھے اور میرے ساتھ یاغستان آئے تھے دو اور
 رفقاء کے ساتھ ایران کے راستے ٹرکی بھیجا۔ مگر افسوس کہ وہ راستے میں ہی
 شہید کر دیئے گئے۔ ان کے صحیح حالات ہم تک نہ پہنچ سکے کیونکہ ان کے دونوں

ساتھی بھی شہید کر دیے گئے اور ان کی شہادت کی خبر بھی ہمیں ایک قافلے سے ملی
بنا کر دند خوش رستے بخون و خاک غلطیدن

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

یسری دفعہ ہم نے جب وفد بھیجا تو روس میں انقلاب عظیم برپا ہو چکا تھا اور
بولشویک لیسن کی سرکردگی میں روس کے دروبست پر قابض ہو چکے تھے۔ ہمیں ان
سے بہت زیادہ توقعات تھیں اور لیسن نے بہت زبانی ہمدردی کی۔ ہمارے سفر
کو بہت عت سے شرف باریابی بخشا اور ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا اس لئے
اس کا ذکر ذرا تفصیل کا محتاج ہے۔ مگر افسوس کہ وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے اور
ان کی حسرتیں دل ہی میں رہ گئیں۔

روس کے عظیم الشان انقلاب کے آثار ۱۹۱۷ء کے شروع میں ہی ظاہر
ہونے شروع ہو گئے تھے اور اخباری خبروں سے ہماری توقعات بہت
زیادہ روس کی شکست سے وابستہ ہو چکی تھیں۔ ہمیں یقین تھا کہ روس
ہتیار ڈال دے گا تو جرمن افواج فرانس اور انگریز کا کچھ مزہ کال دیں گی۔
چنانچہ ہم نے زیادہ تن دہی سے کام کرنا شروع کیا تاکہ ادھر روس ہتیار
ڈالے اور ادھر ہم ہندستان پر حملہ کر دیں۔ خود ہندستان میں بھی بغاوت کے
لئے مواد تیار ہو چکا تھا۔ ہمیں اب یقین ہو چلا تھا کہ ہم خود انگریز کو ہندستان
سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یاغمان کے تمام قبائل میں بنیر کے لوگ
زیادہ تر بزدل سمجھے جاتے ہیں مگر روس کی خبروں سے تمام قبائل میں
ایک برقی لہر دوڑ گئی تھی اور اس کا اثر بنیر اور امب پر بھی ہوا اور وہ لوگ
دل سے ہمارے ساتھ ہو گئے اور انہوں نے یقین دلایا کہ ہم تمہارے ساتھ

ہیں خود نواب امب مرحوم ہماری تحریک میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگے اور خفیہ
 خفیہ ہم سے ملاقاتیں کرتے اور ہمیں ہر ممکن تعاون کا یقین دلاتے۔ نواب ادب
 و در بند محمد زماں خاں مرحوم بہت غلیق اور ہوشمند رئیس تھے اور ہم سے
 ملاقات میں ہر ممکن احتیاط سے کام لینے تھے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات ان
 ملاقاتوں کی اطلاع ان کے ولیعہد نواب محمد فرید خاں موجودہ نواب در بند
 و امب کو بھی نہ ہونی تھی لہ

جرمن کمیشن کے ساتھ جس کا ذکر میں کابل کے واقعات میں کر آیا ہوں، دو
 پٹھان افسر انگریزی فوج سے مفور بھی تھے۔ ان کے نام تو مجھے یاد نہیں، لیکن
 چونکہ ان کا تعلق قبائلی علاقے سے تھا اس لئے وہ ہمارے لئے بہت مفید ثابت
 ہوئے۔ وہ دونوں انگریزی فوج میں صوبے دار تھے اور ان لوگوں میں سے
 تھے جو فرانس کے میدان سے بھاگ کر جرمنوں سے جانے تھے۔ جرمنوں نے
 ان کی خوب خاطر مدارات کی اور ہندستان پر حملہ کے لئے ان سے ہر طرح کی واقفیت
 حاصل کی۔ جب ہم یاغستان کے ارادے سے کابل سے فرار ہوئے تو ہمارے
 یاغستان پہنچنے کے بعد یہ دونوں سردار ہم سے آکر مل گئے۔ چنانچہ انہوں نے
 پہلے تو یاغستانوں کو تربیت عسکری دینی شروع کی جس کا ذکر میں موجودہ مضمون میں
 کر چکا ہوں۔ بعد میں جب میں امت آیا تو وہ ملا بشیر کی معیت میں تیراہ اور
 محمود علاقہ میں گئے۔ اس علاقے میں ان کے اثر سے ملا بشیر کا دورہ بہت
 کامیاب رہا اور وہاں کی نوجوان پارٹی دل سے ہمارے ساتھ ہو گئی۔

لہ محمد زماں خاں کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے:-

محمد فرید خاں موجودہ ابن محمد زماں خاں ابن محمد اکرم خاں ابن پابندہ خاں

انہوں نے سید احمد بریلوی کا زمانہ پایا تھا۔

چنانچہ ان کی مدد سے ہم نے بہادر خیل (ضلع کوہاٹ) کی کسٹم چوکی پر بہت کامیاب حملہ کیا۔ مگر وہاں کے اکثر خوانین انگریزوں کے تنخواہ خوار تھے۔ اس لئے وہ منافقانہ پالیسی پر عمل پیرا رہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نفاق پٹھان قوم کے لیڈروں کے خمیر میں سرایت کر چکا ہے اور اس کی وجہ صرف انگریزی روپیہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو قبائلی انگریزی روپیہ کے لالچ کے اسیر نہ تھے وہی بڑے پکے اور راستباز مسلمان تھے مگر ان کی تعداد بہت قلیل تھی۔ اس عرصے میں پشاور شہر پر بھی دو کامیاب ڈاکے پڑے۔ مگر ان ڈاکوں میں خود صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم کا ہاتھ تھا۔

ان ڈاکوں کی داستان بھی عجیب و غریب ہے۔ یہ بات تو اب معلوم عوام ہے کہ انگریز کو سرحدی ڈاکوں سے محفوظ رہنے کے لئے سالانہ بہت بڑی رقم خرچ کرنی پڑتی تھی اور ایک فنڈ خاص اس غرض کے لئے مخصوص تھا جس کا کوئی حساب کتاب نہ تھا۔ نہ کوئی رسید نہ کوئی ریکارڈ اور نہ آڈٹ۔ ظاہر ہے کہ اس فنڈ کی وجہ سے بڑے کارکنوں اور بالخصوص سرجارج روس کیپل اور صاحبزادہ عبدالقیوم کو خوب ہاتھ رنگنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس لئے جہاں ذرا امن ہوا تو ہندستانی محکمہ خارجہ کی طرف سے سرجارج اور صاحبزادہ عبدالقیوم کو تاکید ہوتی تھی کہ بے حساب رقم کے عنوان میں کمی کریں۔ چنانچہ جب کبھی ایسی تاکید ہوتی تو صاحبزادہ صاحب پانڈستانی قبائلیوں کو اشارہ کر دیتے کہ تم لوگ ذرا زیادہ زور شور سے ڈاکے ڈالو۔ چنانچہ پشاور سے صاحبزادہ صاحب کے آدمی وقتاً فوقتاً مجھ سے بھی ملنے کے لئے آتے تھے۔ اور پشاور پر جو ڈاکے

پڑے وہ ان کے ایما سے ہی ڈالے گئے تھے، لیکن ہمارے ڈاکوں سے صاحبزادہ صاحب کا مقصد فوت ہو گیا۔ کیونکہ تیرا ہی ٹلک وغیرہ جب ڈاکے ڈالتے تھے تو وہ بند و عورتوں کو اور ہندو ماں کو زیادہ تر لوٹے تھے۔ مگر ہم نے جو ڈاکے ڈالے تو وہ خاص چھاؤنی پر ڈالے اور بہت سے اسلحہ جبراً چھین کر لے آئے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس سے صاحبزادہ اور سر جارج کی بہت سخت بدنامی بھی ہوئی۔ مگر انگریزی حکومت ان دونوں حضرات کی اس قدر محتاج تھی کہ ان کے خلاف لب تک نہ ہلا سکی اور یہ معاملہ دبا دیا گیا۔

الغرض ہماری تمام مساعی اس دوران میں صرف انگریزی حکومت کو پریشان کرنے تک محدود رہیں۔ ہم نے مردان کی تحصیل پر ڈاکہ ڈالا اور ادھر پھر شب قدر اور یحییٰ پر باقاعدہ شجون مارے؛ لیکن اس سب کام کی قدر و قیمت اس سے زیادہ نہ تھی کہ انگریزوں کو اپنی سرحدات پر افواج رکھنے کے لئے کثیر مصارف برداشت کرنا پڑتے تھے۔ انگریزی میں اس کی قیمت کو ہم (nuisance value) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ خود انگریزی رپورٹوں میں تھا کہ ایک سال میں گورنمنٹ انگریز کو سینتیس کروڑ روپے سے زائد روپے صرف اپنی سرحدات کو محفوظ رکھنے کے لئے صرف کرنے پڑے۔ لیکن ان سب کوششوں کا کوئی تعمیری نتیجہ برآمد نہ ہو سکا بلکہ انگریزوں نے امیر حبیب اللہ خاں پر اور زیادہ زور دینا شروع کیا کہ ان کے ایجنٹ یعنی میں اور ملا بشیر علانیہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کا پروپیگنڈا کر رہے ہیں اور امیر صاحب کو چاہیے کہ وہ ان سے بالکل قطع تعلق کر لیں۔ چنانچہ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ جب ملا بشیر اپنے معمول کے مطابق اپنی

کارگزاری کی رپورٹ پیش کرنے کے لئے کابل گئے تو امیر حبیب اللہ خاں نے پہلے کی طرح ان سے علائقہ ملاقات نہ کی، بلکہ خود امیر نصر اللہ خاں کے محل میں تشریف لے گئے جہاں ملا بشیر پہلے سے موجود تھے اور وہیں انہوں نے امیر صاحب کی خدمت میں اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ اسے سن کر امیر صاحب نے کچھ مایوسی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ جب تک کوئی بیرونی مدد نہیں مل جاتی ہم انگریزوں سے قطع تعلق نہیں کر سکتے اور علائقہ ان سے کسی قسم کا بگاڑ نہیں پیدا کر سکتے۔

ملا بشیر کی واپسی کے بعد ہم نے اسمت میں ایک مجلس مشاورت منعقد کی اور فیصلہ کیا کہ روس کے راستے جرمنی پہنچنے کی کوشش ایک دفعہ اور کرنی چاہیے۔ چنانچہ ان دونوں قبائلی سرداروں نے کہا کہ ہم جائیں گے اور اگر ممکن ہوا تو لینن سے ملیں گے۔ چنانچہ وہ دونوں سردار اور دو نوجوان ہماری جماعت کے اس خطرناک مہم کے لئے تیار ہوئے۔ امیر حبیب اللہ خاں نے درپردہ ہر قسم کی اعانت کا وعدہ کیا۔ چنانچہ ان کے پروانہ ہائے راہداری افغان حکومت کی طرف سے نائب السلطنت امیر نصر اللہ خاں نے تیار کرادیئے اور وہ کابل سے مزار شریف اور وہاں سے بخارا کے راستے ماسکو تک پہنچے۔ ان کا سفر کافی دل چسپ اور محیر العقول کارناموں سے مزین تھا مگر اس کی تفصیل اس وقت مجھے پوری طرح محفوظ نہیں، لیکن میں نے ان کی غیر حاضری کو عنایت جان کر سندھ کڑی (وادئ سندھ) کا دورہ کیا۔

سندھ کڑی جس کا ذکر میں اوپر بھی کر آیا ہوں جو دریائے سندھ کے آس پار یعنی قبائلی علاقہ کی طرف وادی ہے۔ دریائے سندھ کے اس پار یعنی انگریزی علاقہ میں اس کے بالمقابل بالاکوٹ، وادی کاغان وغیرہ ہیں۔

اس دورہ کی کوئی فوجی یا انقلابی اہمیت نہ تھی مگر پھر بھی اس کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

میں نے پاکستان کے دو تین بڑے تجربہ کار آدمیوں اور مجاہدین میں سے دو یا تین آزمودہ کار رفقا کو لیا۔ ان لوگوں کو اس علاقہ کا کافی تجربہ تھا اور وہ اس وادی کے دشوار گزار راستوں سے خوب واقف تھے۔ میرا دورہ محض اس علاقہ کی سیاحت کی غرض سے تھا اس لئے میں اس کی تفصیلات پیش نہیں کروں گا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ سندھ کٹری کے بالمقابل انگریزی علاقہ تھا اس لئے میرے لئے دریائے سندھ کو عبور کرنا ممکن نہ تھا ورنہ شاید گرفتار ہو جاتا۔ وہ علاقہ نہایت خوبصورت ہے۔ میں نے دریائے رہائن کی وادی (Rhine Valley) واقع جرمنی کی سیاحت کی ہے۔ کسٹیر کے اکثر حصے دیکھے ہیں، جنوبی فرانس کی سیر گا ہوں کی یاد پیمانی کی ہے اور سوئٹزرلینڈ کے بہترین مناظر دیکھے ہیں۔ لیکن میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ قدرتی حسن، نچرل مناظر، آب و ہوا کی عمدگی، خود رو پھولوں کی خوشبو اور مہک، سبزہ زار کی دل فریبی میں شاید ہی وہ اس علاقے کی ہم سری کر سکتے ہوں۔ میں اس علاقے کی دولت کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ افسوس اتنا بڑا اور خوبصورت علاقہ انسان کی غفلت سے ابھی تک یوں ہی پڑا تھا۔ میں نے وہاں ہزار ہا قسم کی تیتریاں دیکھیں۔ سب سے بڑی تیتری کے پر شاید بڑی انسانی ہتھیلی سے دو گنے ہوں گے اور سب سے چھوٹی تیتری جگنو سے کچھ بڑی ہوگی۔ ان کے رنگوں کا تنوع اور پروں کی خوبصورتی الفاظ کی محتمل نہیں ہو سکتی۔ کسی ماہر حیوانیات کے لئے ان کا مطالعہ نفع سے خالی نہیں ہو سکتا۔ کوئی سفید مچھلی رنگ کی، کوئی قرمز، کوئی بنفشی،

کوئی زرد اور کوئی لاجوردی کسی میں ان رنگوں کا ایسا خوبصورت امتزاج تھا کہ

جی چاہتا تھا قدرت صانع پہ ہوں نثار

بہترین کاغذی اخروٹ، فودر و بنفشہ ہزار، عنابوں کے جنگل اور بے شمار

جڑی بوٹیاں وہاں پیدا ہوتی ہیں۔ میرے ہم راہی جو اس علاقے سے واقف تھے

کہتے تھے کہ ان جڑی بوٹیوں میں حیرت انگیز تاثیرات ہیں۔ بعض کینسر کا بدل ہیں

بعض نمونیا میں اکیسیر کا حکم رکھتی ہیں۔ بعض میں اعادہ شباب کی

خاصیت ہے، یہاں تک کہ سفید بال بھی سیاہ ہو جاتے ہیں۔ بعض گھٹیا اور بال چہر

کے لئے اکیسیر کا حکم رکھتی ہیں۔ بعض استسقاء کا کچی علاج ہیں۔ میں کوئی جڑی بوٹیوں

کا ماہر نہیں ہوں لیکن ہماری حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس بڑی دولت کا سراغ

لگائے اور ایسے ریسرچ سکالروں کو بھیجے جو ان بوٹیوں کے خواص معلوم کریں۔

مجھے بعد میں ہندوستان آکر معلوم ہوا کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے کریٹل چو پڑا آئی۔ ایم۔

ایس۔ کی سرکردگی میں ان ادویہ کی ریسرچ کا کام کلکتہ میں شروع کیا ہے۔

علاوہ برآں میں نے وہاں پہاڑوں میں کونکے کی موجودگی اور نو سے

اور تانبے کی قیمتی دھاتوں کی موجودگی کے بھی آثار پائے۔ میں کوئی ماہر معدنیات

نہیں ہوں لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ سندھ کی یہ وادی معدنی دولت سے مالا مال ہے

اور ممکن ہے کہ وہاں بھی (Radio Active) معدنیات بھی ملیں۔ بہر حال اب

چونکہ وہ سارا علاقہ ہمارا ہے اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اچھی طرح سے اس کی

جانچ پڑتال کر کے اس کے معدنی دولت کا سراغ لگائیں اور اس کی غیر متناہی برقیاتی

قوت سے فائدہ اٹھا کر پاکستان کو امریکہ بنا دیں۔

سندھ کٹری میں آبادی بہت قلیل ہے اور جگہ جگہ چھوٹی بوٹیوں میں لوگ رہتے

ہیں۔ ان کی عورتیں بالعموم نہایت خوبصورت، دراز قد، سفید فام ہوتی ہیں۔

ان کے بال سنہری، پیشانی کشادہ، آنکھیں بڑی اور بھوری، سر کے بالوں کو وہ بھونڈے طریق پر رکھتی ہیں۔ عموماً کئی کئی چوٹیاں ہوتی ہیں۔ ان کے لباس میں نیلی شلوار جس پر کئی پیوند لگے ہوتے ہیں اور ایک لمبا سا کرتہ بنلے یا سیاہ رنگ کا اور سر پر چھوٹا سا ٹکڑا بطور روپے کے ہوتا ہے۔ وہ لوگ صابن سے قریباً ناواقف ہیں اور نہانا وغیرہ بھی ان کے لئے ایک بہت غیر معمولی تکلف کی بات ہے۔ کپڑے پر پیوند پر پیوند لگاتی جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ بالکل ناکارہ ہو کر پھینکنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہی حال مردوں کا ہے۔ وہ بہت خوش شکل، سڈول اور محنتی ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کی غذا صرف کئی کی روٹی ہوتی ہے۔ وہ سالن یا وال سے قریباً نا آشنا ہیں۔ ہاں شہر کی بکھیاں، بکری اور بھینس ان کے پالتو جانور ہیں جن کے دودھ اور مکھن اور لسی کو وہ بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ کئی کی روٹی کو عموماً لسی کے ساتھ گھی سے چمڑ کر کھانا ان کی بہترین اور پُر تکلف غذا ہے۔ کئی بہت میٹھی ہوتی ہے اور بھٹا بھی ہمارے بھٹے سے قریباً دو گنا ہوتا ہے۔ یوں تو جانوروں کا گوشت بھی وہاں بکثرت مل سکتا ہے۔ چکورا، تیترا، برفانی تیترا، برفانی چکورا، مرغ وغیرہ بکثرت مل سکتے ہیں۔ ان کو بھی وہ صرف آگ پر بھون کر کھا لیتے ہیں۔ ہنڈیا میں پکانے سے وہ قریباً نا آشنا ہیں۔ کئی کی روٹی بھی وہ پتھروں پر سینک کر پکاتے ہیں کیونکہ میں نے وہاں تو انہیں دیکھا۔ پتھر پر پکی ہوئی کئی کی روٹی نہایت لذیذ ہوتی ہے۔ قصہ مختصر ان کی زندگی بالکل بدویانہ ہے۔ سردی بہت سخت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جون جولائی میں ہمیں پستین اور لحاف کی ضرورت ہوتی تھی مگر ان لوگوں میں جفاکشی کے باوجود وحشت اور بربریت نام کو نہیں۔ وہ بہت بردبار، جہان نواز، صادق القول لوگ ہیں۔ ابھی تک موجودہ تہذیب و تمدن کو ان کے اخلاق بگاڑنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

میں جب اسمت پہنچا تو میں نے امیر نعمت اللہ سے معدنی دولت اور
 پہاڑی لکڑیوں کی افراط و غیردکا ذکر کیا مگر انہوں نے کہا کہ ہم لوگ تو انگریزوں کے
 ڈر کے مارے ان علاقوں کے حالات شائع نہیں کرتے ورنہ انگریزوں کو بھی ان
 علاقوں کو مستحضر کر کے ان کی دولت کو اپنے قبضہ میں لایا جاتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔
 اتنے میں سردار صاحبان بھی اپنے سفر سے واپس مع انگریزوں چکے تھے۔
 انہوں نے نہ صرف انقلاب روس پر خوب روشنی ڈالی بلکہ لینن سے ملاقاتوں کی
 تفصیل بھی بیان کی۔ لینن نے بہت ہمدردی اور عزت سے انہیں اپنے ہاں مہمان
 رکھا۔ ہماری ساری سکیم کو سنا اور کہا کہ افسوس کہ ہم اس وقت چاروں طرف
 سے دشمنوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ ان سے پیٹ لیں تو پھر آپ کی اعانت کریں گے
 بشرطیکہ امیر صیب اللہ مزاحم نہ ہوں، لیکن انہوں نے ہمیں ہدایت کی کہ ہم پورے
 زور سے گوریلا جنگ جاری رکھیں کیونکہ سرمایہ دار سلطنتوں کو پریشان کرنا ہی وقت
 کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ انہوں نے یہاں تک کہا کہ اگر بخارا کا راستہ
 صاف ہو گیا تو ہم افغانستان کے راستے آپ کی ہر ممکن اعانت کریں گے کیونکہ
 لینن کو ہماری اس رائے سے اتفاق تھا کہ مغربی امپیریلزم کا سرکچلنے کے لئے
 انگریزوں پر کاری ضرب لگانا نہایت ضروری ہے۔

ایک بات اور نہایت ہی عجیب ان سے معلوم ہوئی لیکن بعد میں باوجود
 تحقیقات کے اس کی تصدیق نہ ہو سکی۔ صرف حضرت مولانا صیب اللہ سندھی مرحوم نے
 جلاوطنی سے واپسی پر مجھ سے لاہور میں اس واقعہ کی تائید کی۔ اس لئے میں اسے
 بھی سپرد قلم کرنا مناسب نہیں خیال کرتا۔

روس کے انقلاب کے دوران میں لینن کو یہ یقین ہو گیا کہ سب نوع انسان
 کو خدا کے خیال سے چھڑانا محالات سے ہے اس لئے اگر ایسا مذہب اختیار

کر لیا جائے جو کمیونٹ اصولوں کے ساتھ چل سکے تو کمیونٹ انقلاب سرعت سے تمام دنیا میں پھیل سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہمیں مذہب اسلام اختیار کر لینا چاہیے۔ اس خیال کو انھوں نے اپنی پارٹی کے ایک خفیہ اجلاس میں پیش کیا۔ پارٹی میں سخت ہنگامہ بپا ہو گیا۔ لیکن نے کہا کہ اس طرح ہنگاموں سے کام نہ بنے گا۔ تم بھی غور کرو اور میں بھی سوچ بچار کرتا ہوں۔ اگلے سال اس مسئلہ پر پھر بحث کریں گے۔ چنانچہ پارٹی کا جلسہ برخاست ہو گیا۔ اور لیکن نے تحقیقات شروع کر دی۔

لیکن کے اس ارادہ کی خبر اسلام کے ازلی دوستوں یعنی انگریزوں کو بھی ہو گئی۔ چنانچہ انھوں نے فوراً ایک فتویٰ اس مضمون کا لکھوایا کہ روس بولشویک خدا اور رسول کے دشمن ہیں اور بولشوزم ہر مذہب کو مٹانے کے درپے ہے۔ اس لئے اس کے خلاف ہتھیار اٹھانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اس فتوے پر مصر، حجاز، شام، ایران، ہندستان کے جلیل القدر علما کے دستخط تھے۔ وہ فتویٰ کئی زبانوں میں چھاپ کر بطور اشتہار روس میں تقسیم کیا گیا۔ اس کی اطلاع جب لیکن کو ملی تو وہ مذہب اسلام کی طرف سے مایوس ہو گئے کہ اس مذہب کے علما بھی رجعت پسندی میں عیسائی علما سے کسی طرح کم نہیں ہیں اور اس نے مذہب اسلام اختیار کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ مولانا سندھی مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے سٹالن سے ایک ملاقات کے دوران میں اسلام کی خوبیاں بیان کیں تو وہ کہنے لگے کہ مولانا جو کچھ آپ کہتے ہیں ممکن ہے صحیح ہو اور میں آپ کی تکذیب نہیں کرتا، لیکن کیا آپ ایک اسلامی ملک بھی ایسا بنا سکتے ہیں جہاں پر اسلامی قانون کی حکومت ہو یا اسے خلافت راشدہ کا مثنیٰ قرار دیا جاسکے۔ مولانا فرمانے لگے کہ میں نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

آمدیم ہر سر مطلب۔ دراصل ہمارا یہ مشن بھی ناکام رہا کیونکہ لیکن کی موجودہ

اندازہ پہنچ سکی اور ہماری کوششیں تمام تر گوریلا جنگ یا ڈاکہ زنی تک محدود رہیں۔ اب ہمیں بھی یقین ہو چلا تھا کہ ہماری سکیم کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ یورپ میں جنگ کا نقشہ اب بدلنے لگا تھا بلکہ امریکہ کی آمد سے جنگ کا نقشہ بالکل بدل گیا اور اتحادیوں کی فتح کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ امیر حبیب اللہ خاں تو اب علانیہ انگریزوں کی حمایت کرنے لگے اور ہمیں ہر ممکن طریقے سے دباؤ شروع کیا۔

قبائلی بھی انگریز سے مسلسل برس پیکار نہ رہ سکتے تھے اس لئے ان کے جڑوں

نے اب صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی۔ چنانچہ اس جنگ کے دوران میں بھی یہی ہوتا تھا کہ تین چار ماہ کی ڈاکہ زنی کے بعد قبائلی روپیہ لے کر تین چار ماہ کے لئے خاموش بیٹھ جاتے تھے۔ مگر جب ۱۹۱۵ء میں قبائلیوں کے جرگے صلح کے لئے سر جارج روس کیپل (چیف کمشنر) کے پاس آئے تو انہوں نے صلح کی پیشکش کے ساتھ ایک نئی شرط پیش کی کہ تم لوگ مولوی سلیمان کو ہمارے حوالے کر دو۔ اس پر قبائلیوں نے صاف انکار کر دیا۔ مگر سر جارج نے کہا کہ ہم انہیں گرفتار نہیں کرنا چاہتے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہندوستان آکر مقیم ہو جائیں۔ سر جارج بھی قبائلیوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ کیوں نہ مولوی سلیمان مجھ سے آکر بالمشافہ گفتگو کر لیں بعض ملکوں نے کہا کہ آپ انہیں دعوت دیں۔ چنانچہ میرے نام باقاعدہ سرکاری دعوت نامہ صاحبزادہ عبدالقیوم خاں مرحوم پولیٹیکل ایجنٹ خیبر کی طرف سے بھیجا گیا۔ جب یہ دعوت نامہ اسمت پہنچا تو امیر لغمت اللہ اور ملا بشیر نے چند مخلص احباب کو بلوا کر ایک مجلس مشاورت منعقد کی۔ بہت بحث و تھیس کے بعد جس میں میں خود بھی شریک تھا یہ فیصلہ ہوا کہ میں اس دعوت کو قبول کر لوں۔

شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد

مجھے پشاور کے سفر کی صحیح تاریخ یاد نہیں۔ مگر غالباً جولائی ۱۹۱۸ء میں ڈیپٹی برکت علی صاحب کی معیت میں میں پشاور پہنچا۔ صوبہ سرحد کی گورنمنٹ نے ہمارا بہت پرہیزگار استقبال کیا اور ہمیں شاہی مہمان کی حیثیت سے صاحبزادہ سر عبدلہ قیوم کے ہاں رکھا گیا۔ صاحبزادہ صاحب مرحوم نے ہماری خاطر داری میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔ مگر پیشتر اس کے کہ میں پشاور کے حالات تفصیل سے قلمبند کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے رفیق سفر ڈیپٹی برکت علی صاحب کا تعارف ناظرین سے کرادوں کیونکہ ان کا اثر ہماری گفتگوئے صلح پر بہت گہرا پڑا۔

ڈیپٹی برکت علی صاحب مرحوم (یہی ان کا اصلی نام تھا) گوجرانوالہ (پنجاب کے رہنے والے اور پنجاب میں سینئر سب جج تھے) ۱۹۱۷ء میں ان کے پیش پر ریٹائرڈ ہونے کا زمانہ قریب تھا کہ سر شادی لال چیت جج ہائی کورٹ لاہور کے عتاب میں آگئے اور ان پر دو مقدمات رشوت ستانی کے بنا دیئے گئے۔ ان میں انھیں ہر دو مقدمات میں دو دو سال قید کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ ڈیپٹی برکت علی صاحب کی عمر اس وقت پچپن سال کے لگ بھگ تھی۔ اس پیری میں بجائے پیش کے قید بامشقت کی سزا کا ملنا ان کے لئے روح فرسا تھا۔ وہ والد صاحب قبلہ مرحوم و معذور کے پرانے دوست تھے۔ والد صاحب مرحوم و معذور نے نہ صرف ان کی طرف سے ہائی کورٹ میں اپیل، دائر کی بلکہ پانچ ہزار روپیہ کی ضمانت پر انھیں دوران سماعت اپیل کے لئے رہا کروالیا۔ والد صاحب قبلہ کو یقین تھا کہ سر شادی لال اپیل کو مسترد کریں گے۔ اس لئے فیصلہ سے ایک دن پہلے انھوں نے پرائیویٹ طور پر ہائی کورٹ سے پتہ لیا کہ کیا فیصلہ سنایا جائے والا ہے انھیں اطلاع ملی کہ حسب وقع ضمانت منورخ اور قید کا حکم بحال رہے گا۔ رات کو مشورہ

ہوا۔ اب یا تو ڈپٹی صاحب کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا یا پھر انہیں سرحد پار بھیج کر زر ضمانت ضبط کر دیا جاتا۔ والد صاحب قبلہ نے اپنے مالی نقصان کو ترجیح دیتے ہوئے اسی رات ڈپٹی صاحب کو ہری پور ہزارہ کے راستے میرے پاس بھجوا دیا۔ جب ہائی کورٹ نے فیصلہ سنایا اور ان کی ضمانت کی ضبطی اور انہیں اشتہاری مجرم قرار دینے کے احکام نافذ کئے۔ ان کی تفصیل سے تو ہمیں سروکار نہیں لیکن ڈپٹی صاحب جب میرے پاس پہنچے تو وہ میرے لئے خاصے سوہان لروح ثابت ہوئے۔

ڈپٹی صاحب اس زمانے کے تعلیم یافتہ بوجھوں کی طرح بالکل سیریل بلکہ اور یہ تھو اورل کیکلے، انگریز سال وغیرہم کے بڑے دلدادہ۔ میں بچپن سے ان کی بے حد عزت کرتا تھا اور وہ بھی مجھے بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔ اسی بڑائی کا فائدہ اٹھا کر وہ میری ہر بات پر اعتراض کرتے، کبھی نماز کی سہنی اڑاتے، کبھی دعاؤں کی، کبھی میرے انفتابی پر دو گرام کی تضحیک کرتے۔ لیکن میں ان تمام باتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا۔ مگر ڈپٹی صاحب نے یاغستان کو بھی ہندستان سمجھا اور ایک دن چند قبائلی سرداروں کے سامنے اپنے عقائد نہایت بے باکی سے بیان کرنے لگے بس پھر کیا تھا۔ نہ صرف جماعت مجاہدین میں بلکہ اردگرد کے قبائلی علاقوں میں بھی غم اور غصہ کی لہر دوڑ گئی بڑے مولوی (یعنی راقم) کے پاس ایک ہندستانی ملحد آیا ہوا ہے جو معاذ اللہ اسلام، خدا سے اسلام اور مسلمانوں کو گالیاں دیتا ہے۔ چنانچہ بعض کٹر ملاؤں نے ان کے قتل کا فتویٰ دیدیا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ میرا اثر دباں بہت زیادہ تھا اور لوگوں کو مجھ سے بے حد عقیدت تھی اور میری نعمت اللہ بھی بڑے صاحب ثروت تھے کہ یہ آندھی میری کوششوں سے اتر گئی، مگر میں نے پہلی دفعہ ڈپٹی صاحب کو بہت ملامت کی کہ اس طرح کی نا عاقبت اندیشی نہ صرف مذموم ہے بلکہ اس میں میری اور ان کی جان

جانے کا بھی خطرہ ہے۔ خیران کے مباحث کی داستان تو بہت طویل ہے۔ خدا کی شان
کہ ڈپٹی صاحب بہت سخت بیمار ہو گئے۔ ہم نے ان کے لیے پشاور سے ڈاکٹر بلوایا
اور علاج وغیرہ میں انتہائی کوشش کی مگر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اب ڈپٹی صاحب دن رات روتے کہ ہائے میرا خاتمہ اس ویران وادی
میں اپنے نبوی بچوں سے دور ہو رہا ہے۔ ایک رات میں نے انہیں سمجھایا کہ خدا پر
بھروسہ کرنا چاہیے۔ آخر آپ میری طرف بھی تو دیکھیے کہ میں اپنی ساری عمر سعی
بے حاصل میں صنایع کر رہا ہوں لیکن کبھی افسوس نہیں ہوتا۔ اس پر وہ بہت بگڑے
اور بہت سی فضول باتیں میرے عقائد کے متعلق اور میرے انقلابی پروگرام کے
متعلق کہہ گئے۔ مجھے بھی اس وقت طیش آگیا۔ میں نے کہا کہ ڈپٹی صاحب ہم آپ
سے ایک شرط بدتے ہیں۔ آپ دعا کے اثر کے قائل نہیں اور میرا ایمان ہے کہ
دعا سے قوموں کی تقدیریں بھی بدلی جاسکتی ہیں اس لئے میں آج رات آپ کی صحت
کے لئے دعا کروں گا۔ اگر آپ کو صبح تک شفا کے کامل نہ ہو جائے تو آپ کا جو جی چاہے
مجھے سزا دیجئے گا اور نہ آپ اپنے بلخدا نے عقائد سے تو بہ کیجئے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ ایک
رات آپ بھی میرے ساتھ شریک دعا ہوں۔“

تہجد کی اذان ہوئی (اسمیت میں تہجد کی بھی اذان ہوتی تھی) اور میں بیدار
ہوا۔ اٹھ کر وضو کیا اور ڈپٹی صاحب کو بیدار کیا۔ آنکھوں نے تیمم کیا اور بستر پر لیٹے
لیٹے دعا کرنی شروع کی۔ میں نے بھی سجدے میں جبین نیاز رکھ دی اور بہت گڑگڑا
کر خدا سے دعا کرنی شروع کی کہ ”خدا یا! تیرے ایک نہایت ہی گنہگار اور
روسپاہ بندے نے محض تیری رحمت پر بھروسہ کر کے اتنی بڑی شرط لگائی ہے۔
تو اسے ذلیل مت کیجیو،“ یعنی کیجئے کہ میں دعا کرتا جاتا تھا اور میرے دل میں یقین

ہوتا جاتا تھا کہ میری دعوت قبول ہو رہی ہے۔ چنانچہ ڈپٹی صاحب کا بخارا رتنا شروع ہوا اور عین اُس وقت جب کہ صبح کی اذان ہو رہی تھی تو میں نے اٹھ کر ڈپٹی صاحب کا ٹیپر چر لیا تو وہ بفضلہ، ڈگری تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور مسجد میں نماز ادا کرنے کے لئے چلا گیا۔

ڈپٹی صاحب پر اس کا حیرت انگیز اثر ہوا۔ صبح اٹھتے ہی انہوں نے اپنے عقائد سے توبہ کی اور قرآن شریف کا ترجمہ اور حدیث شریف پڑھنا شروع کی اور بعض ضروری کتب فقہ بھی پڑھیں اور نہایت مندرجہ اور تہجد گزار مومن ہو گئے۔ گو جراثیم میں جب وہ والد صاحب مرحوم و معذور سے ملے تو انہوں نے نہایت محبت سے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ "مولوی صاحب! میرے اس بھتیجے نے میری عاقبت کا سامان کر دیا۔"

غرض اس کے بعد ڈپٹی صاحب بالکل ہی بدل گئے تھے۔ وہ ہر بات میں ہم سب کے شریک کار رہے اور ہم نے ان کے مشوروں کو بہت مفید پایا۔ اس لئے جب میں پشاور جانے لگا تو انہیں ساتھ لیتا گیا تاکہ ان کی پختہ خیالی میری نوجوانی اور بے فکری کے لئے روک کا کام دے۔

پشاور پہنچ کر پہلے تو تو صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم سے نہایت مفصل باتیں ہوئیں۔ صاحبزادہ صاحب نہایت ذہین، ہوشمند اور زیرک انسان تھے اور انگریزی ملازمت نے ان کے طبعی خواص کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ سیاست ان کے رنگ و ریختے میں سرایت کر چکی تھی۔ انگریزی حکومت ان کی بے انتہا عزت کرتی تھی اور شاید حضرت سر سید احمد مرحوم کے بعد کسی مسلم یا غیر مسلم رہنما کو انگریزی دربار میں اس قدر عزت نصیب نہیں جتنی کہ صاحبزادہ صاحب کو۔ سر جارج روس کیپل سے لے کر وائسرائے، کمانڈر انچیف بلکہ سکریٹری آف سٹیٹ اور وزیر اعظم انگلستان تک، ان کے بلا مبالغہ

مرید تھے اور ان کی ہر بات انگریز کے لئے پتھر کی لیکر کا حکم رکھتی تھی۔ میں اپنے ذاتی علم و بصیرت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ پچھلی جنگ عظیم میں صاحبزادہ عبدالقیوم کی شخصیت تھی جس نے ہندستان میں انگریزی حکومت کی گرتی ہوئی دیوار کو تھاما۔ درحقیقت کابل سے میرے اخراج کا واحد سبب ہی صاحبزادہ صاحب تھے۔ کیونکہ انہی کے ناخن تدبیر نے پیر صاحب کی خدمات مستعار لی تھیں۔ صاحبزادہ صاحب نہایت شیریں مقال و وسیع النظر شخص تھے مگر افسوس کہ ان کی ساری قابلیت ذاتی اور خاندانی وجاہت سب کی سب انگریزی راج کی خدمت کے لئے وقف ہو چکی تھیں۔ وہ ددھیال، ننھیال، دولوں طرف سے نجیب الطرفین پیروں کی اولاد اکبر تھے اور گورنمنٹ انگریزی نے ان کے اثر سے خوب فائدہ اٹھایا۔ صاحبزادہ صاحب ہماری تحریک کے موثر ترین مخالفوں میں سے تھے۔ ان کی ساری زندگی میرے سامنے مثل آئینہ روشن تھی اس لئے مجھ پر ان کا جادو نہ چل سکا۔ انہوں نے مجھے بہترے سبز باغ دکھائے اور سمجھانے کی کوشش کی کہ میں اپنی زندگی ایک بے کار مشغلہ میں الجھ کر برباد نہ کروں۔ ایک دن میں نے بھی جوش میں آکر انھیں خوب ملامت کی اور کہا "کہ صاحبزادہ صاحب! آپ کو خدا نے حسن صورت، حسن اسیرت، خاندانی وجاہت، عزت نسب، دنیاوی مال و جاہ، قابلیت و شہرت سبھی نعمتیں عطا کر رکھی ہیں۔ مگر افسوس کہ بجائے اس کے کہ آپ خدا کا ان نعمتوں پر شکر یہ ادا کرتے آپ نے ان تمام فطری قوتوں کو خدا کے دین کی تخریب اور کفر کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ خدا کی خدمت کے لئے اسی تن دہی سے سے کھڑے ہو جاتے جس طرح کہ آپ انگریزی کی خدمت کے لئے وقف ہو چکے ہیں۔ تو آپ بھی سید جمال الدین افغانی، سید عبدالقادر الجرائری، سید احمد سینیوسی، پرنس سعید حلیم یا نور پاشا کی طرح اسلامی دنیا میں معزز اور ممتاز ہوتے اور مسلمانوں

کے زندہ جاوید رہنا ثابت ہوتے۔ مگر افسوس کہ آپ نے عاجل نفع کو چن لیا اور دنیا میں منہمک ہو کر عجبی سے بے نیاز ہو گئے۔ کیا آپ کو کبھی خیال نہیں آتا کہ آپ کو خدا کے حضور میں جانا ہے اور اپنے تمام اعمال کا جواب دینا ہے۔ میری تقریر جاری تھی اور صاحبزادہ صاحب کی آنکھوں سے اشک جاری تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان پر میری تقریر کا پائدار اثر ہوا یا عارضی مگر اتنا تو ضرور ہوا کہ وہ جتنی دفعہ بھی سے گزرتے میرے ہاں تشریف لاتے اور بار بار کہتے کہ "مولوی صاحب! میرے لئے خدا سے مغفرت کی دعا کیجئے کہ وہ مجھے حشر کے مواخذے سے بچائے۔"

پشاور میں ہمارے قیام کے تیسرے دن سر جارج روس کیپل چیف کمشنر صوبہ سرحد نے گورنمنٹ ہاؤس میں ہماری دعوت کی۔ کھانے کے بعد سر جارج ہم دونوں کو ایک پرائیویٹ نشست گاہ میں لے گئے۔ صاحبزادہ عبدالقیوم ان کے ساتھ تھے۔ ہم چاروں ایک گول میز پر بیٹھ گئے۔ اور گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا جو قریباً چار گھنٹہ تک جاری رہا۔ اس گفتگو کے اکثر حصے مجھے اب تک یاد ہیں۔ ان کے میرے ذہن میں نقش ہو جانے کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس گفتگو کے بعد میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ دوسرے سر جارج اس کے بعد دو دفعہ بمبئی تشریف لائے اور خاص طور پر مجھ سے ملے۔ ان ملاقاتوں میں بھی وہ اپنے خیالات دہرائتے رہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک انگریز مبصر کی جورا کے مسلمانوں کے متعلق تھی اسے شرح و بسط سے مسلمانوں کے سامنے پیش کروں تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ انگریزی سیاست کا کیا انداز ہے اور ان کی مساعی کے متعلق انگریز مبصرین کی کیا رائے ہے اور وہ سوچیں کہ ہم کدھر بچے جا رہے ہیں۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ کہ سر جارج کی اکثر آراء سے میں متفق نہ تھا مگر پھر بھی ان کے الفاظ میں ہمارے لئے کافی غور و فکر کا سامان ہے۔ یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس تمام گفتگو کے دوران میں

سر جارج کاروئے سخن اور خطاب صرف میری طرف ہی تھا اور انہوں نے ایک لفظ بھی ڈپٹی صاحب سے مخاطب ہو کر نہ کہا جسے خود ڈپٹی صاحب نے اور میں نے بھی بہت محسوس کیا۔ سر جارج مجھ سے بہت احترام سے گفتگو کرتے رہے اور مولوی صاحب کہہ کر خطاب کرتے رہے۔ گو سر جارج کو پشلیو پر ٹواہل زبان کی سی قدرت تھی اور اردو اور فارسی بھی خاصی اچھی بولتے تھے مگر مجھ سے ان کی گفتگو انگریزی میں ہوئی۔

سر جارج - مولوی صاحب! میں تو اکھڑ آدمی ہوں، لگی لپٹی کہنے کا عادی نہیں ہوں۔ اس لیے میں آپ سے ذرا بے تکلفی سے بات چیت کرنی چاہتا ہوں۔ کہیے اب تو آپ کو یقین ہو گیا ہے یا نہیں کہ آپ کی مساعی بالکل بے نتیجہ اور لا حاصل تھیں اور وہ کبھی بھی کامیاب نہ ہو سکتی تھیں اور اب تو یہ جنگ بھی ختم ہو رہی ہے اور اتحادیوں کی فتح اور ان کے دشمنوں کی شکست یقینی ہے اور آپ لوگ جنگ کے خاتمہ کے بعد بالکل یتیم ہو جائیں گے۔ اس لئے کیا آپ کے لئے مناسب نہیں کہ اپنی ناکامی تسلیم کر لیں اور گورنمنٹ انگلشیہ جیسے طاقت ور حریف سے خواہ مخواہ برسر پیکار نہ رہیں بلکہ صلح کر لیں۔

میں - سر جارج! بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ ایک سرکاری مہمان سے اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ اگر میں بھی ترکی بہ ترکی جواب دینا شروع کر دوں تو معاملہ بگڑ جائے گا اور ہماری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس اکھاڑہ بن جائے گی۔ مگر میں آپ کے جواب میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر امیر حبیب اللہ سنہری زنجیروں میں نہ جکڑے گئے ہوتے تو آج اس جنگ کی تاریخ ہی دوسری طرح لکھی جاتی اور سر جارج اس قدر فخر و مباہات سے سرا و سچا نہ کر سکتے۔ میں نے جو کچھ کیا سوچ سمجھ کر کیا تھا اور ایک مکمل منصوبہ کے تحت کیا تھا۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہماری

اسکیم میں امیر حبیب اللہ خاں نے روڑا اٹکا دیا۔

سر جارج۔ آپ امیر حبیب اللہ خاں کو خواہ مخواہ کوستے ہیں وہ تو نہایت
دورانہ پیش اور عقل مند بادشاہ ہیں اور موجودہ اسلامی دنیا کے بہترین سیاسی
لیڈروں میں سے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا انگریزی روپیہ کی وجہ سے نہیں کیا اور نہ ہم
نے انہیں روپیہ دیا بلکہ محض ملک کی خیر خواہی کے لئے کیا۔ خیر۔ اب آپ بتائیے
کہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ آپ کا خواب کہ سارے
ہندوستان میں ایک اسلامی حکومت قائم کی جائے شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا اور
آپ ہم سے لڑ کر پتھر سے سر بھوڑیں گے۔

میں۔ سر جارج! یہ تو میرا ایمان ہے کہ نہ صرف ہندوستان پر بلکہ تمام دنیا پر
ایک نہ ایک دن اسلام کا جھنڈا لہرائے گا۔ اس لئے ہر مسلم کا فرض ہے کہ وہ
اس کے لئے سر دھڑکی بازی لگا دے اور آپ جانتے ہیں کہ ایمان و یقین محض عقل
کے تابع نہیں ہوا کرتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایمان انسان کو ایک قدم اٹھانے پر
بجور کرتا ہے پھر عقل اس کی کامیابی کے اسباب فراہم کرتی ہے۔ آپ اس بحث
کو جانے دیجئے کہ میرا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے یا نہیں کیونکہ میں تو خدا سے
ہمد کر چکا ہوں کہ جب تک میرے جسم میں جان ہے میں اسلام کی سر بلندی کے
لئے ہر ممکن کوشش کرتا رہوں گا، لیکن میں اتنا اب بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہماری
حقیر مسماعی نے روپیہ کی قلت کے باوجود آپ کے کروڑوں روپیہ سالانہ کے
خرج کو بانٹ کر دیا اور اسلام میں اب بھی اتنی قوت ہے کہ وہ اس بلے سر سامانی
کی حالت میں بھی کفر کی سب سے بڑی سلطنت سے ٹکرا سکتا ہے۔ مگر میں آپ سے
پوچھتا ہوں کہ آپ اس بحث میں ایسے بغیر بتلائیے کہ آپ نے مجھے کیوں یاد فرمایا ہے
سر جارج۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ آپ ایسا ذہین اور

قابل شخص اپنی زندگی پہاڑوں میں برباد کر دے۔ اب آپ کا فوری کام تو ختم ہو چکا ہے کیونکہ نہ تو آپ امیر افغانستان کو تیار کر سکتے کہ وہ ہم پر چڑھائی کریں اور نہ آپ ہندستان میں ہندو کو بغاوت پر تیار کر سکتے۔ جنگ کا خاتمہ اب قریب ہے اور اس میں ہماری فتح یقینی ہے لہذا آپ کے لئے اس سے بہتر موقع نہیں ہو سکتا کہ آپ بجائے پتھروں سے سر پھوڑنے کے ہندوستان آجائیں اور اپنی فطری صلاحیتوں سے کام لیں۔

میں۔ میں آپ کی ہمدردی کا ممنون ہوں مگر آپ کو معلوم ہے کہ میں اس تحریک میں تنہا نہیں ہوں۔

سر جارج۔ ہاں میں خوب جانتا ہوں کہ آپ کی جماعت نہ صرف یاغستان میں ہے بلکہ ہندستان میں بھی بہت سی باغی ہیں جو آپ کے شریک کار ہیں گوا بھی تک ہم اٹھیں پکڑ نہیں سکتے۔ آپ بڑے شوق سے اپنی یاغستانی مجلس شوریٰ سے مشورہ کر لیجئے اور اگر ضرورت ہو تو ہندستان میں بھی کانگریسی لیڈروں سے اور اپنے والد صاحب سے مشورہ کر لیجئے۔

میں۔ بفرض مجال مشورہ کے بعد اگر یہی طے پایا کہ میں انڈین گورنمنٹ کی اس پیش کش کو قبول کر لوں تو میرے ساتھیوں کا کیا حشر ہوگا؟

سر جارج۔ آپ کے ساتھیوں میں سے ملا بشیر، مولوی محمد موسیٰ اور مہاجر لڑکے وغیرہم کو تو میں ہندستان واپس آنے کی اجازت دے دوں گا، لیکن ڈپٹی برکت علی، مولوی ولی اللہ قصوری، مولوی عبدالوہاب سندھی کو معافی نہیں مل سکتی کیونکہ وہ اشتہاری مجرم اور قانوناً مفرور اور سزا یافتہ ہیں۔

میں۔ کیوں میں بھی تو اشتہاری مجرم ہوں بلکہ میرے سر پر تو الغام بھی مقرر ہے۔

سر جارج۔ یہ ٹھیک ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ آپ سزا یافتہ نہیں اور فرنٹیر نظام حکومت میں مجھے غیر محدود اختیارات ہیں۔ میری سفارش کو گورنمنٹ آف انڈیا کبھی مسترد نہیں کر سکتی، لیکن میں تناظر و رکھوں گا کہ آپ کے بارے میں بھی جنگ کے خاتمہ کے بعد بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

میں۔ تو آپ فرنٹیر اختیارات کو استعمال کر کے ڈپٹی برکت علی اور مولوی ولی اللہ اور مولوی عبدالوہاب کو بھی معافی دے سکتے ہیں۔

سر جارج۔ نہیں۔ ان کی پوزیشن مختلف ہے۔ ڈپٹی برکت علی کو ہائی کورٹ نے سزا دی ہے۔ مولوی ولی اللہ کو فریڈ کوٹ ہائی کورٹ نے اور مولوی عبدالوہاب کو سندھ ہائی کورٹ نے۔ اس لئے ان فیصلوں کو میں کسی طرح بھی مسترد یا کالعدم نہیں قرار دے سکتا۔

میں۔ دائرے تو اپنے شاہی اختیارات سے ان سزاؤں کو

منسوخ (Commute) کر سکتے ہیں۔

سر جارج۔ جہاں تک مجھے علم ہے دائرے سرمایہ کیل اوڈو اور گورنر پنجاب کے مشورے کے بغیر اپنے اختیارات کو محض میری سفارش پر استعمال نہیں کریں گے اور سرمایہ کیل نہایت سخت سزا آدی ہیں۔ وہ کبھی بھی اس پر راضی نہیں ہوں گے۔ وہ اسے سرکار انگریزی کی توہین خیال کریں گے۔ جب میں نے گورنمنٹ آف انڈیا میں آپ کے متعلق تحریک کی تو سرمایہ کیل نے آپ کی واپسی کی سخت مخالفت کی مگر چونکہ آپ کا ریکارڈ بہت شاندار تھا اور انگریزی گورنمنٹ چوں کہ بہادر ہے اس لئے ایک بہادر دشمن کی عزت بھی کرنا جانتی ہے۔ اس لیے میں نے زور دے کر گورنمنٹ آف انڈیا اور سکرٹری آف اسٹیٹ سے منوالیا کہ مولوی محمد علی کا یاغستان سے چلے آنا اس وقت فرنٹیر کے امن کے لئے ضروری ہے

چنانچہ سر ایمل کو بھی بالآخر رضامند ہونا پڑا اور میں نے محض اس خیال سے کہ شاید آپ بمشورہ کے لئے پنجاب جانا چاہیں، گورنمنٹ آف انڈیا سے اجازت منگوا لی ہے کہ آپ کو دہلی تک جانے کی اجازت ہے۔ آپ کل صبح مجھے بتلا دیں تو میں لاہور کے ڈپٹی کمشنر کے نام قصور کے ایس۔ ڈی۔ او۔ اور کپتان پولیس کے نام تار کر دوں گا اور آپ کے لئے فرنٹیئر میں ڈپٹی ریئر وکر دوں گا تاکہ آپ بغیر کسی مزاحمت کے وہاں جا کر مشورہ کر سکیں۔ پنجاب کے قیام کے دوران میں آپ پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوگی مگر آپ سے مجھے اتنی توقع ضرور ہے کہ کسی پبلک جلسہ میں آپ تقریر نہیں کریں گے۔ آپ جب تک آپ کا جی چاہے وہاں قیام کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد ہم واپس اپنی قیام گاہ پر لوٹ آئے۔ صاحب زادہ صاحب ہمارے ساتھ تھے۔ جب میں اور ڈپٹی برکت علی صاحب کمرے میں الگ ہو کر بیٹھے تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ڈپٹی صاحب رورہے ہیں۔ میں نے پوچھا تو فرمانے لگے کہ تم تو آزاد ہو گئے اور ہم اس بڑھاپے میں حوار ہونے کے لئے اکیلے رہ جائیں گے۔ تمہارے ساتھ دستگی تھی سو تم بھی ہمارا ساتھ چھوڑ رہے ہو۔ میں نے کہا ڈپٹی صاحب آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ میں انشاء اللہ آپ کی رہائی کے لیے پوری کوشش کروں گا۔

شام کے کھانے پر صاحب زادہ صاحب سے بڑی مفصل گفتگو ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ مولوی صاحب میری دیانت دارانہ رائے یہی ہے کہ آپ کو سر جارج کی پیشکش کو فی الفور قبول کر لینا چاہئے۔ کیونکہ اگر جنگ ختم ہوگئی تو پھر آپ کی فوری واپسی کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔ میں نے کہا کہ میں تو ابھی واپسی کے لئے اس قدر تیار نہیں البتہ اگر ڈپٹی برکت علی صاحب کی واپسی کا انتظام ہو جائے

تو بہت اچھا ہوگا۔ صاحب نے کہا کہ یہ بہت مشکل ہے،
لیکن آپ کا پنجاب جانے کے متعلق کیا خیال ہے۔ میں نے کہا کہ
صبح عرض کروں گا۔

رات کو بہت دیر تک میں اور ڈپٹی صاحب مصروف گفتگو رہے۔
ڈپٹی صاحب کو اصرار تھا کہ مجھے یہ زریں موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے اور
انھیں یقین تھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا مجھ سے اس قدر خائف ہے کہ اگر میں زور
دوں گا تو وہ ان کی ربائی پر بھی رضامند ہو جائے گی۔ صبح کو ناشتے پر میں نے
صاحبزادہ صاحب سے کہہ دیا کہ میں پنجاب جاؤں گا۔ چنانچہ انھوں نے اسی
وقت سر جارج کو فون کر کے سیری روانگی کا انتظام کر دیا اور میں دوسرے دن
فرنیٹر میں سوار ہو کر لاہور روانہ ہوا۔ میرے ساتھ ایک انگریز پولیس افسر
سادہ لباس میں سفر کر رہا تھا۔

میرے قصور پہنچنے کی خبر قصور کے ایس۔ ڈی۔ او۔ مسٹر مٹرنے والد
صاحب مرحوم کو پہنچا دی تھی۔ چنانچہ وہ خبر تمام شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔
فرنیٹر میں چونکہ ان دنوں رات کے گیارہ بجے قصور سے گزرتا تھا اس لئے میں
رات لاہور ٹھہر گیا اور دوسرے دن صبح کی گاڑی پر سوار ہو کر قصور روانہ ہو گیا۔
وہ انگریز افسر برابر میرے ساتھ تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ تمام راستہ بھر
نہ تو اس نے مجھ سے بات کی اور نہ مجھے یہ شبہ ہونے دیا کہ وہ میری نگرانی کے لئے
مقرر ہے۔ قصور پہنچ کر میں نے دیکھا کہ پلیٹ فارم شائقین سے بھرا ہوا ہے اور
لوگوں نے میرا پر تپاک خیر مقدم کیا۔ کپتان پولیس بھی اسٹیشن پر موجود تھے۔ اس
انگریز افسر نے ان سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ اب یہ آپ کے چارج میں ہیں اور وہ
خود چلا گیا۔ قصور میں میرے آنے کی خوشی میں تمام سکول بند کر دیئے گئے اور

تمام دن لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔

دوسرے دن سے نہ صرف میرے اعزاء و اقربا بلکہ میرے دوست احباب دور دور سے ملنے کے لئے آنے شروع ہو گئے۔ کئی دن تک تو حضرت قبلہ والد صاحب مرحوم سے مشورے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بالآخر ان سے مفصل بات چیت ہوئی تو ان کی برائے ہوئی کہ اب ہندستان میں رہ کر کام کرنے کا موقع ہے اس لئے اس پیشکش سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس کے بعد میں نے راجھی مولانا آزاد کے پاس، چھندو اڑہ۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے پاس اور دہلی حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کی خدمت میں خاص معتمدین مشورے کے لیے روانہ کیے۔ سب کی یہی رائے تھی کہ اب ہندستان آ کر کام کرنے کا وقت ہے۔ اب ہندستان سے باہر رہ کر چنداں مفید کام نہیں ہو سکتا۔ اس دوران میں میں دہلی بھی گیا اور وہاں پہلی مرتبہ بابائے اُردو جناب مولوی عبدالحق صاحب سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ ان کے ایما پر میں حیدرآباد بھی ملازمت کے لیے قسمت آزمائی کرنے گیا، مگر حیدرآباد میں میرے جیسے باغی کے لیے کہاں جگہ تھی۔ خیر یہ طویل قصہ ہے۔ میں ہفتہ عشرہ اپنے بھائی مولوی محی الدین احمد صاحب کے ہاں بی دسویہ ضلع ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) میں جا کر ٹھہرا۔ وہ ان دنوں دسویہ میں نظر بند تھے۔ ان کی رائے بھی دوسرے بزرگوں کی رائے سے متفق تھی۔

قصہ مختصر میں کافی مدت قیام کے بعد واپس پشاور پہنچا۔ وہاں ڈپٹی برکت علی صاحب میرے منتظر تھے۔ سر جارج نے اب کی مرتبہ مجھے تنہا دعوت دی۔ صرف صاحبزادہ صاحب موجود تھے۔ اب انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں گورنمنٹ انگریزی کی پیشکش قبول کرتا ہوں مگر ایک شرط ہے کہ کم از کم ڈپٹی برکت علی کو میرے ساتھ آزادی دی جائے۔ مگر آخری فیصلہ کرنے سے

پہلے میں یاغستان واپس جا کر اپنے احباب سے مشورہ ضرور کروں گا۔ سر جارج نے کہا کہ بے شک تم یاغستان جا کر مشورہ کر لو مگر ڈپٹی برکت علی کی شرط کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔ ان سے رخصت ہو کر میں اور ڈپٹی صاحب صاحبزادہ صاحب کے ایک معتمد کے ساتھ سرحد پار ہو گئے اور واپس اسمت پہنچ گئے۔

اسمت میں سب احباب جمع تھے۔ جب میں نے ان سے ہندستانی بزرگوں کی رائے کا ذکر کیا تو ان سب پر اوس پرگئی۔ وہ میری جدائی کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ سب سے زیادہ قلق ملا بشیر مرحوم کو تھا کیونکہ ہم دونوں اس تمام تحریک کی روح رواں تھے۔ تین چار دن کی بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ میں متوکل علی اللہ ہندستان چلا جاؤں مگر اس انقلابی تحریک کی زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں ہی رکھوں اور ہندستان کے شرکائے کور کے تعاون سے ہندستان میں انقلابی تحریک کے لیے سازگار فیضا پیدا کرنے کی کوشش کروں۔ یہ بھی طے پایا کہ افغانستان میں انقلاب پیدا کرنے اور جماعت مجاہدین کی اصلاح کی تحریک کو بدستور جاری رکھا جائے۔

قبائلی علاقے میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ میں ہندستان واپس جا رہا ہوں۔ چنانچہ اکثر علاقوں سے میرے پاس وفود آئے۔ ان میں سے اکثر کی یہ رائے تھی کہ میں ہندستان نہ جاؤں بلکہ وہیں کسی عمدہ علاقے میں شادی کر کے بس جاؤں اور ان لوگوں کی تنظیم کا کام اپنے ہاتھ میں لوں۔ مگر میں نے انھیں سمجھایا کہ جب تک ہندستان آزاد نہ ہو قبائلی تنظیم چندان مفید نہیں ہو سکتی۔ میں ہر وفد کو ہدایت دے کر رخصت کرتا رہا۔ اس میں تین ماہ سے زائد صرف ہو گئے۔

اتنے میں شاید دو تین واقعات رونما ہو گئے۔ جن کی صحیح تاریخیں یاد نہ ہونے

کے باعث میں ان کی تقدیم و تاخیر کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ پہلا واقعہ تو یہ ہوا کہ صاحبزادہ صاحب کا خاص آدمی آیا اور کہا کہ سر جارج روس کیپل گورنمنٹ آف انڈیا کو منوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ وہ ڈپٹی برکت علی کو بھی واپسی کی مشروط اجازت دے۔ مگر شرائط اسی وقت بتلائی جائیں گی جب تم یہاں آ جاؤ گے اور اگر تم آنا چاہتے ہو تو فی الفور بلا تاخیر آ جاؤ ورنہ سرمایہ اڈوائس کو کھنڈت ڈالنے کا موقع مل جائے گا۔ اس پیغام کے پہنچنے کے بعد میں بالکل تیار ہو گیا۔ ایک جمعہ کو خطبہ میں میں نے تمام جماعت مجاہدین سے اور بہت سے قبائلی خواتین سے رخصتانہ خطاب کیا۔ خوش قسمتی سے میں نے اس خطاب کا خلاصہ اپنی تفسیر کے آخر میں لکھ لیا تھا اور اس وقت اس تفسیر کو ملا بشیر کے حوالہ کر آیا تھا۔ لیکن ۱۹۲۸ء میں میرے محترم رفیق مولانا فضل الہی مرحوم اس کتاب کو واپس لے آئے اور اب وہ میرے پاس ہے۔ آگے چل کر میں اس طویل خطبہ کے بعض اقتباسات ہدیہ ناظرین کروں گا تاکہ انھیں معلوم ہو سکے کہ اس وقت میری قلبی کیفیت کیا تھی اور آئندہ کے لئے میں کیا کیا غلام نیکر ہندستان پہنچا تھا۔ دوسرا واقعہ جو غالباً اس وقت سے واپسی پر پیش آیا وہ یہ تھا کہ ستمبر ۱۹۲۸ء میں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ترکی نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور انگریزی فوجیں قسطنطنیہ (سابق دارالسلطنت ترکی) میں داخل ہو گئی ہیں۔ اس خبر نے مجھ پر بجلی کا سا اثر کیا۔ میرے تمام اعضا شل ہو گئے۔ رہی وہی امیدوں پر پانی پھر گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ میں نے اپنی تمام عمر برباد کر لی۔ مگر حدیث شریف کے حکم کے مطابق دو رکعت نماز کی نیت باندھی اور خدات دعا مانگنی شروع کی۔ اس نماز میں مجھ پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئیں اس کے بعد میں سو گیا۔ کوئی چار بجے صبح کا وقت ہو گا کہ یک لخت میری آنکھ کھل گئی۔ نہایت سہانا وقت

تھا پرندے چہچہا رہے تھے اور ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ اچانک مجھے ایسا معلوم ہوا کہ تمام عالم بفقہ نور بن گیا ہے۔ اب آواز آئی شروع ہوئی خاموش! خاموش! اللہ میاں تقریر فرماتے ہیں "اب تقریر شروع ہوئی۔" اے میرے مسلمان بندو! تم کیوں روتے ہو۔ تمہارے رونے سے ہمیں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ہماری درگاہ میں مایوسی سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں۔ ہم نے یوسف کو کنوئیں میں ڈالا۔ اس لیے نہیں کہ ہم اسے اس وقت بچا نہیں سکتے تھے، نہیں، بلکہ اس لیے کہ تیس سال بعد اسے تختِ خلافت پر متمکن کر دیں۔ تمہارا کام جان دینا ہے سوال کرنا نہیں۔ ہماری درگاہ میں مایوسی سے بڑا کوئی گناہ نہیں،" تقریر ختم ہیں وہ تمام نور ظہور ختم ہو گیا۔ صبح صادق کا وقت ہو گیا۔ پرندے چہچہانے لگے اور میرا قلب اس وقت عجیب اطمینان سے معمور ہو گیا۔ اس واقعہ کی ٹھنڈک میں اب تک اپنے قلب میں محسوس کرتا ہوں۔

آدم برسرِ مطلب۔ میری رخصت کا وقت آن پہنچا۔ جامع مسجد اسمت میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ میں جب الوداعی تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو میرا بدن جذبات کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ میری آنکھیں پر نم تھیں۔ ایک ایک کر کے تمام واقعات میری آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ میرا افغانستان سے فرار، دشوار گزار راستوں سے گزر کر کنٹرول پہنچنا اور چمکنڈ داخل ہونا، جہاد کے ولولے، انگریزی حکومت کو زیر و زبر کر دینے کے منصوبے، اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواب، قبائلیوں کی محبت و عقیدت، ملا صاحبان کی شفقت و مہربانی بالآخر میں نے اپنے تئیں سنبھالا اور خطاب شروع کیا۔

"برادرانِ من! آج میری زندگی کا بہت المناک واقعہ ظہور پذیر ہو رہا ہے یعنی میں آپ سے رخصت ہو رہا ہوں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں کیا کیا ارادے

لے کر اس سرزمین میں داخل ہوا تھا اور ان ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میں نے آپ لوگوں کی اعانت سے کیا کیا جتن نہیں کیئے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو ابھی منظور نہیں تھا کہ ہمارے خواب شرمندہ تعبیر ہوں اور اب حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کی بنا پر ہماری جماعت نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اب ہندستان میں کام کریں اور انگریز کی حکومت کو اندرونی شورش سے ہلا دیں۔ اس لئے میں آپ سے رخصت ہو رہا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میں نے اپنی شکست کو تسلیم کر لیا ہے، بلکہ اس لیے کہ اب محاذ جنگ کا نقشہ بدل گیا ہے۔ میں جس طرح پہلے اسلام کا ادنیٰ سپاہی تھا آئندہ بھی تمام عمر انشاء اللہ ویسا ہی جاں نثار سپاہی رہوں گا۔ میرا آپ سے انشاء اللہ بڑا گہرا تعلق رہے گا اور میں آپ کے ہر اقدام میں براہ راست دلچسپی لیتا رہوں گا۔

”برادرانِ من! سب سے پہلے تو میں آپ کی محبت اور مسافر دوستی کا شکریہ ادا کرتا ہوں، میں بیک وقتہنا آپ کے ہاں آیا اور آپ نے میری اس قدر عزت کی کہ مجھے سر پر بٹھایا۔ میں سپاہی کے طور پر آیا تھا اور آپ نے مجھے اپنا سردار تسلیم کیا۔ آپ کی محبت کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ دو ایک باتیں آئندہ کے کام کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔

”آپ کو معلوم ہے کہ حضرت سید احمد صاحب بریلوی نے یہ تحریک جہاد محض اس لئے شروع کی تھی کہ انگریزوں کو ہندستان سے نکال کر وہاں اسلامی سلطنت علیٰ منہاج الخلافہ قائم کی جائے اور پھر ہندستان کو تمام عالم کی اصلاح کے لئے مرکزی خطہ قرار دیکر تمام دنیا میں اللہ کی حکومت قائم کی جائے۔ حضرت سید صاحب کا مشن یہ تھا کہ دنیا سے جو ر و ظلم، فسق و فجور، بد امنی اور فساد اور جہالت و بدعت کو مٹا کر اسے عدل و انصاف، نیکی و راستبازی، امن و اخوت

علم و بصیرت سے معمور کر دیا جائے اور اس مشن کی تکمیل میں انہوں نے اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کی۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس کے بعد ان کے بہادر اخلاف نے انگریز کے خلاف جہاد کی مہم کو جاری رکھا اور جنگ آزادی کے جھنڈے کو سرنگوں نہ ہونے دیا، لیکن افسوس کہ ان کے اس نیک کام کو ہم لوگوں نے بھلا دیا اور ایک موہوم خیال کی پرستش کرنی شروع کی، اور وہ یہ کہ حضرت سید صاحب شہید نہیں ہوئے بلکہ وہ زندہ ہیں اور وہ دوبارہ ظہور کر کے ہند کو کفر کے تسلط سے نجات دلائیں گے۔ یہ عقیدہ بالکل فاسد اور باطل ہے۔ میں نے حتی الوسع اپنے قیام کے دوران میں اس عقیدہ کی تردید کی ہے۔ اب پھر کہتا ہوں کہ آپ میں سے ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حضرت سید احمد ثانی بن جائے۔ اور اسلام کا جھنڈا ہاتھ میں لیکر دنیا کو عدل و انصاف سے معمور کرنے، جمود و نا انصافی کو مٹانے، علم و بصیرت کی روشنی کو پھیلانے اور جہالت اور بدعت کو فنا کرنے، نوز ہدایت کو عام کرنے اور توہم پرستی کی خرافات کو فنا کرنے کے لئے اپنا تن من دھن قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اٹھو! میرے بھائیو! اٹھو۔ تم خدا کے سپاہی ہو۔ تم حزب اللہ ہو۔ اٹھو! اور دنیا کو دکھا دو کہ خدا کے سپاہی کیوں کر رحمت مجتہد بن کر رحمت اللعالمین کا پیام دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچاتے ہیں۔ اٹھو! ہمارے اسلاف کے زرمینہ کا رنامے، ان کی عدیم المثال قربانیاں، ان کی خدمتِ خلق کے جذبات آپ کو دعوت دے رہے ہیں کہ تم بھی خدا کے بن جاؤ تو حسدا بھی تمہارا

ان تنصروا اللہ ی نصرکم و ینتھب اقدامکم

اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہارے

قدموں کو مضبوط کر دے گا

”اٹھو! فتح و نصرت ہماری ہے۔ دنیا کی سیادت ہماری ہے۔۔۔۔۔“

وغیرہ“ یہ تقریر بہت لمبی تھی۔ میں نے اس کے چند کلمے پلٹ کر دیے ہیں۔

اس کے بعد میں سب اجباب سے بغل گیر ہو کر رخصت ہوا اور گھوڑے

پر سوار ہو کر سرحد کی طرف روانہ ہوا۔ میری آنکھیں اشکبار تھیں۔ میرے

قدم پھاری ہو رہے تھے اور دل اس خیال سے کہ شاید یہ جدائی دائمی

ہو بیٹھا جا رہا تھا۔

پشاور پہنچ کر میں اور ڈپٹی برکت علی صاحب صاحبزادہ عبدالقیوم

خاں کے ہاں میٹم ہوئے۔ دوسرے دن ہم تینوں سر جارج روس کیپل کے

ہاں کھانے پر گئے، کھانے کے بعد انھوں نے پہلے تو فرمایا کہ مولوی صاحب!

محض آپ کی صد کی وجہ سے میں نے گورنمنٹ آف انڈیا پر زور دیا کہ ڈپٹی

برکت علی کی سزا کو بھی شاہی اختیارات سے منسوخ (Comhute)

کر دیا جائے، لیکن سرماییکل اوڈ وائر نے اتنی سخت مخالفت کی کہ مجھے

اندیشہ ہو گیا کہ کہیں آپ کی واپسی کا معاملہ بھی کھٹائی میں نہ پڑ جائے۔ لیکن

میں نے گورنمنٹ آف انڈیا اور سکریٹری آف سٹیٹ کو یقین دلایا کہ آپ کا

ہندستان آجانا ہمارے لیے بہت مفید ہے۔ اسی لیے وائسرائے نے ڈپٹی

برکت علی کے لیے مندرجہ ذیل شرائط پر واپسی کی اجازت دیدی ہے۔

اول۔ ان کی جلا وطنی کو قید میں محسوب کر لیا جائے اور ان کی رضامنت

کی ضبطی کا حکم منسوخ کر دیا جائے۔

دویم۔ آئندہ بھی جب تک ان کی قید کی میعاد ختم نہ ہو جائے یہ پنجاب نہ جائیں بلکہ مانسہرہ میں میری حکومت میں ٹھہریں۔ انہیں اپنے اہل و عیال کو بلا کر ساتھ رکھنے کی اجازت ہوگی۔ ان پر کسی قسم کی پابندی نہ ہوگی اور نہ ہی ان کی ڈاک وغیرہ منسوخ ہوگی۔ مانسہرہ میں میں نے ان کے لئے ایک ہوادار مکان تجویز کر دیا ہے۔

سویم۔ ہم انہیں کوئی وظیفہ نہ دیں گے۔ مگر اس خیال سے کہ یہ اپنا گزارہ چلا سکیں ان کے بڑے بیٹے کو جو پنجاب میں ہیڈ ماسٹر ہیں، مانسہرہ میں ہیڈ ماسٹر بنا دیں گے اور ان کو وہی تنخواہ دیں گے بلکہ فرنٹیئر الائنس بھی دیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے صاحبزادہ کو اشارہ کیا اور وہ ڈپٹی برکت علی صاحب کو لے کر چلے گئے۔ پھر انہوں نے مجھے دوستو اشرفی طلائی کی تھیلی پیش کی اور کہا کہ یہ سرکار انگریزی کی طرف سے آپ کی مہمانی ہے۔ میں نے بہت انکار کیا مگر انہوں نے کہا کہ نہیں یہ ہمارا دستور ہے اور آپ اسے مسترد نہ کریں۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ ”مولوی صاحب! میں آپ کی تمام مساعی کو دیکھتا رہا ہوں اور میں نے گورنمنٹ انگریزی سے اس امر کی منظوری لے لی ہے کہ آپ کو کوئی نہایت عمدہ عہدہ دیا جائے تاکہ آپ کی قابلیت ضائع نہ ہو۔“

میں۔ ”مجھے سرکاری خدمت سے معذوری رکھئے۔“

سر جارج۔ (مسکرا کر) ”کیوں ابھی تک آپ کے دماغ میں اسلامی

حکومت کے قیام کا خیال بسا ہوا ہے؟“

میں: ”یہ خیال تو میرے رگ و ریشے میں پیوست ہو چکا ہے۔ میں کسی صورت میں بھی انگریزی ملازمت قبول نہیں کر سکتا۔“

سر جارج: ”مجھے بہت افسوس ہو گا کہ آپ ایسا ہونہار نوجوان اپنی قابلیت اور عمر ایک بیکار خیال کی تحصیل کے لیے ضائع کرے۔ میں یہ آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میری آفیسرڈ کر کے آپ صرف اپنا نقصان کر رہے ہیں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ سرکاری رہنمائی سے آپ ہندوستانی مسلمانوں کے دوسرے سرسید احمد خاں بن سکتے ہیں۔“

میں: ”میں آپ کی عنایت کا بہت مشکور ہوں لیکن میں ہندوستانی مسلمانوں کا دوسرا سرسید بننے کی بجائے دوسرا سید احمد بریلوی یا اسماعیل شہید بننا چاہتا ہوں۔“

سر جارج: (مسکرا کر) ”اس خیال کو دل سے نکال دیجئے۔ انگریزی حکومت ایسی دوراندیش اور عقلمند ہے اور مسلمان من حیث القوم اس قدر بے وقوف اور آسانی سے خریدے جاسکتے ہیں کہ کبھی بھی ان کے رہنماؤں کو خریدنے میں دقت پیش نہیں آئی۔ اگر ہمیں مولوی محمد علی نہیں مل سکتا تو کئی اور محمد علی مل جائیں گے۔ اور یہ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ مسلمان ایسی سادہ لوح قوم ہے کہ وہ اپنے اصل رہنماؤں کی پیروی کی بجائے ہمارے منتخب کردہ یا نامزد کردہ رہنماؤں کا دیوانہ وار پیروی کریں گے۔ ان کی تاریخ ہی ثابت کرتی ہے کہ وہ اپنے رہنماؤں کی پیروی نہیں کرتے، پرستش کرتے ہیں۔ اور جو قوم اپنے رہنماؤں کی پرستش کرتی ہے وہ ان کی غلطیوں کو نہ صرف نظر انداز کرتی ہے بلکہ انہیں بھی محاسن میں شمار کرتی ہے۔“

مولوی صاحب! ذرا سوچئے کہ ہم نے کیونکر مسلمانوں کے انہی علماء و مشائخ کی مدد سے محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک کو فنا کر دیا ہندستان میں سید احمد صاحب بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک کو ملیا میٹ

کر دیا۔ ترکی اور ایران میں سید جمال الدین افغانی اور مدحت پاشا کی تحریک کو کچل دیا اور یہ سب کام آپ کے اپنے علماء و مشائخ اور رہنماؤں نے کیا۔ آپ بھی اگر سرکار انگریزی کے خلاف چلیں گے تو آپ کا بھی وہی حشر ہوگا جو آپ سے پیشتر انگریزی استعمار کے دشمنوں کا ہوا۔ میں پھر آپ سے کہتا ہوں کہ ہم آپ کو بڑی سے بڑی ملازمت پیش کر سکتے ہیں تاکہ آپ کی قابلیت اور چمکے اور آپ دنیا کے اسلام کی ممتاز ترین ہستیوں میں شمار ہونے لگیں۔ میں ”مجھے معاف ہی رکھئے“

سرجار ج۔ ”اچھا میں ایک بات اور آپ سے کہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آپ اپنی یاغستانی مہموں اور جماعت مجاہدین کے پوسٹ کنندہ حالات لکھ دیجئے۔ میں خود انھیں ایڈٹ کروں گا اور گورنمنٹ انگریزی اپنے خرچ پر انھیں چھپوائے گی اور میرا خیال ہے کہ آپ کو کم از کم ایک لاکھ روپیہ بطور رائلٹی گورنمنٹ انگریزی سے دلوا دوں گا۔ میں ”شکریہ۔“

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ آن است

بردار تو آن گفت وہ مسبر نواں گفت

یہ حالات تو میرے سینے میں ہی رہیں گے۔ ہاں جب گورنمنٹ انگریزی

ہند سے چلی جائے گی تب یہ صفحہ قرطاس پر شاید آئیں۔“

سرجار ج۔ ”مجھے افسوس ہے کہ آپ اتنی مفید معلومات کو اپنے سینے

میں ہی دفن کئے رکھیں گے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آپ کی زندگی میں تو برٹش

حکومت ہندستان کو خالی نہیں کرے گی۔“

غرض بہت طویل گفتگو کے بعد میں رخصت ہو کر صاحبزادہ عبدالقیوم

خاں کے مکان پر چلا آیا۔ میرے آنے کے کوئی پانچ منٹ بعد سر جارج کا ایڈی کانگ اشرفیوں کی تھیلی لے کر آیا کہ مولوی صاحب آپ بچوں آئے تھے، ڈپٹی برکت علی کے اصرار پر میں نے تھیلی رکھ لی اور جب صاحبزادہ صاحب چلے گئے تو میں نے وہ تھیلی ڈپٹی صاحب کی نذر کر دی اور کہا کہ یہ لیجئے آپ کا دو سال کا خرچ آگیا۔

اس کے بعد میں شاید دو تین دن پشاور میں ٹھہرا۔ اس دوران میں مجھے صاحبزادہ صاحب نے پشاور اسلامیہ کالج میں ڈنر دیا۔ ڈنر کے بعد میری تقریر ہوئی جس کا عنوان تھا "مسلمان لڑکوں کا نصب العین" پشاور کالج کے متعلق مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ صاحبزادہ صاحب نے مجھ سے میرے تاثرات دریافت کئے اور میں نے یہ شعر پڑھا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بد نام نہ ہوتا

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سو جھی

بالآخر سر جارج ریس کیپل نے مجھے بلا کر کہا کہ گورنمنٹ آف انڈیا سے آپ کی روانگی کی منظوری آگئی ہے اور آپ اب جا سکتے ہیں۔ چنانچہ میں واپس قصور آگیا۔

قصور میں اس وقت بڑے سخت ہنگامے ہو رہے تھے اور گاندھی جی کی پلول پر گرفتاری کے سبب کئی انگریز ہندوستانی غصے کا شکار ہو چکے تھے چنانچہ انگریز نے بھی نہایت سخت انتقامی کارروائی کرنے اور اہل پنجاب کو سبق سکھانے کا تہیہ کر لیا تھا، اور قصور، لاہور، گوجرانوالہ، امرتسر وغیرہ میں مدشل کا اعلان کر کے ہر صاحب اثر ہندوستانی کو گرفتار کر لیا تھا اور ان کے خلاف جھوٹی شہادتیں بنا کر ان پر بغاوت کے سنگین مقدمے قائم کر دیئے

تھے۔ قصور میں بھی ریلوے اسٹیشن پر چھ سولیاں گاڑی گئی تھیں اور کپٹن ڈون
(Cap. Doveloi) قصور کے ایریا کمانڈر تھے۔ ان کا حکم تھا کہ شہر
قصور کی تمام مزد آبادی روزانہ مارچ کر کے ان سولیوں کے گرد جمع ہو۔ جب
سب لوگ جمع ہو جاتے تھے تو کپٹن صاحب ایک عدد تقریر ارشاد فرماتے
تھے جو قریباً ایک ہی ہوتی تھی۔ وہ تقریر مجھے اب تک یاد ہے۔

”تم ہندوستانی لوگ کٹا ہے۔ تم نے ٹن صاحب لوگ اور
میم صاحب لوگ قتل کر دیا ہے۔ ہم تم میں سے ٹن سوکٹوں کو سولی پر
لٹکائے گا۔“

اس دوران میں سر مائیکل اوڈواٹر کے حکم سے مجھے میرے والد محترم
اور بڑے بھائی صاحب کو بناوت کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور ہمارے
خلاف ایک قتل کو یہ شہادت دینے پر مجبور کیا گیا کہ یہ دونوں بھائی اپنے
باپ کے حکم سے تاروں کے کچھوں پر چڑھے ہوئے تھے اور کٹ رہے تھے۔
یہ اتنا ٹرا سفید جھوٹ تھا کہ بے چارے سسٹر مٹر (ایس۔ ڈی۔ ادا) اور
احمد حسین خاں مرحوم (کپتان پولیس) دونوں نے اس پر احتجاج کیا کہ محمد علی
کی تو باقاعدہ دائری رکھی جاتی تھی یہ ان دنوں قصور میں موجود ہی نہ تھا۔
یہ مقدمہ کیوں کر چل سکے گا۔ خیر۔ بصد مشکل مجھے تو چھوڑ دیا گیا اور والد
صاحب قبلہ کو اور بھائی صاحب مولوی محی الدین احمد کو جیل میں بند کر دیا گیا۔
مادشل لا کی سختیاں بڑھتی جا رہی تھیں اور گورنمنٹ انگریزی انتہائی تشدد
پر اتر آتی تھی کہ ایک معجزہ رونما ہوا۔ میرے پاس یاغستان سے سفیر آیا
کہ امیر حبیب اللہ خاں قتل کر دیے گئے ہیں اور ان کی جگہ امیر نصر اللہ خاں کی
جگہ امیر امان اللہ خاں کابل کے بادشاہ بن بیٹھے ہیں اور انہوں نے انگریزی

حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔ ملا بشیر اور قبائل شوریٰ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ وہ کیا کریں۔ میں۔ میں نے بلا تامل کہا کہ امیر امان اللہ خاں کی ہر ممکن امداد کرو۔ چنانچہ ہماری تنظیم نے امان اللہ خاں کو بچالیا اور نادر شاہ مرحوم کو فاتح عقل بنا دیا۔ یہ قصہ تو بہت طویل ہے اور انشاء اللہ علیہ فرصت میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالوں گا۔ مارشل لا کی شدید پابندیوں کے باوجود وہ قاصد مجھ تک پہنچا بھی اور واپس چلا بھی گیا۔

مجھے اسی وقت اطمینان بھی ہو گیا کہ اب مارشل لا اٹھ جائے گا۔ چنانچہ اس کے شاید تین دن بعد سر مائیکل اوڈوائٹر کے دو خاص آدمی میرے پاس آئے اور کہا کہ سر مائیکل نے آپ کو یاد کیا ہے۔

جب میں لاہور پہنچا تو سر مائیکل کے پرائیویٹ سکرٹیری سر جان فریچ نے مجھ سے افغانستان کی فوجوں کے متعلق سوالات کرنے شروع کئے۔ میں نے کہا کہ افغانستان کا بچہ بچہ سپاہی ہے۔ کوئی ایک گھنٹہ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد انہوں نے کہا کہ افغانستان نے کمال نادانی سے ہمارے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے اور سر مائیکل کی خواہش ہے کہ آپ ہمارے سفیر بن کر افغانستان جائیں تاکہ آپ قبائلیوں کو جنگ سے باز رکھ سکیں۔ سرکار انگریزی آپ کو تین ہزار روپیہ ماہوار علاوہ تمام اخراجات کے دے گی اور اگر آپ کامیاب واپس آئے تو بہت بڑی جاگیر اور سکرٹری شپ آپ کو بطور انعام دیا جائے گی۔ میں نے بہت سختی سے انکار کیا۔ اس پر مجھے سر مائیکل کے حضور میں پیش کیا گیا۔ سر جان فریچ نے کچھ ان کے کان میں میرے متعلق کہا۔ اس پر سر مائیکل کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور وہ لال بھبھو کا ہو کر بولے۔

”کیا تم انکار کرتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم ابھی تک سرکار کے دشمنوں

سے تخواہ لیتے ہو۔ یاد رکھو تم اور تمہاری آنے والی نسلیں روئیں گی۔
 میں نے بہت تحمل سے کہا کہ "سر مائیکل آپ اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ
 اٹھا رہے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ایسی بات آپ کو زیب نہیں دیتی۔"
 اس کے بعد مجھ میں اور ان میں خاصی سخت کلامی ہوئی اور سر مائیکل نے
 آگ بگولا ہو کر کہا کہ اگلیں میرے سامنے سے نکال دو۔ خیر مجھے سر جان فرینچ اپنے
 ساتھ لے گئے اور ایک سیکنڈ کلاس کا پاس دیا اور سرکاری موٹر میں مجھے
 ریلوے سٹیشن پر پہنچا دیا۔

قصور میں میں دوسرے دن والد صاحب قبلہ سے جیل میں ملنے گیا تو میں
 نے ان سے کہا کہ انشاء اللہ آپ سب رہا ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔
 دوسرے ہی دن سٹیشن سے وہ پھانسیاں غائب ہو گئیں اور مارشل لا قریباً ختم ہو گیا۔
 انگریز سپاہی تمام سرحد کی طرف تہیج دیئے گئے۔

اس کے دو ایک دن بعد مجھے پھر لاہور طلب کیا گیا اور پھر سر مائیکل نے
 مجھ سے پوچھا کہ میں افغانستان میں سفیر کی حیثیت سے جانا چاہتا ہوں یا نہیں۔
 ان کی دھمکیوں اور میرے انکار پر مجھے پھر قصور پہنچا دیا گیا۔ لیکن اس کے دوسرے
 ہی دن شیخ اصغر علی مرحوم آئی، سی، ایس، اور سر جان فرینچ دونوں قصور آئے
 شیخ اصغر علی ان دنوں پولیس کے افسر اعلیٰ تھے اور بعد میں کمشنر لاہور بنائے
 گئے۔ یہ دونوں افسر سیدھے جیل گئے اور انہوں نے گورنمنٹ کے احکام سے
 والد صاحب قبلہ مرحوم و معذور کو رہا کیا اور ان سے بہت معافی مانگی کہ آپ کو بلاوجہ قید
 و بند کی مصیبت برداشت کرنا پڑی۔ اس کے بعد اچھیں موٹر میں سوار کر کے
 ہمارے گھر آئے۔ اور مجھ سے والد صاحب کے سامنے کہا کہ ہم اب آخری مرتبہ
 سر مائیکل کی آفرے کرتے ہیں۔ شیخ اصغر علی چوں کہ والد صاحب کے بہت بے تکلف

دوست تھے، خاص طور پر نیچے گئے تھے۔ انہوں نے بہت زور دیا مگر میں اپنے اٹھارہ پر قائم رہا اور وہ دو لڑکیاں خفا ہو کر چلے گئے اور اس طرح یہ ڈراما ختم ہو گیا۔

یہاں بطور تہنیتاً انشاء عرض کر دینا کافی ہے کہ جب امیر امان اللہ خاں نے فتح کی خوشی میں معنی تقسیم کئے تو تین اعلیٰ ترین معنی اور شاہ غازی اور ملا بشیر اور راقم الحروف کو کو مرحمت ہوئے۔ وہ معنی ان خدمات کے صلہ میں تھا جو ہماری جماعت نے افغانستان کے استحکام کے لئے کی تھیں۔

ہندستان میں واپسی کے بعد میری مساعی ختم نہیں ہو گئیں بلکہ انہوں نے ایک نئی راہ نکالی۔ اور اس کی داستان بہت طویل ہے، انشاء اللہ پھر کسی وقت اسے بھی قلمبند کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس وقت عربی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے وہ سپرد قلم کر کے رخصت ہوتا ہوں۔

لا تقنطوا لدرینشر عقد لا

لیعود احسن بالنظام واجملا

”ما یوس مت ہو کیوں کہ ہمارے موتی پریشان کئے جاتے ہیں تاکہ انہیں ایک نئے اور خوبصورت دھاگے میں پرو دیا جائے۔“
اسلامی خلافت کے قیام کے متعلق میرے عقائد اب بھی وہی ہیں بلکہ اور زیادہ منجھ گئے ہیں۔ واللہ ولی التوفیق۔

اسٹوڈنٹس انگلش اُردو ڈکشنری

یہ اسٹوڈنٹس انگلش اُردو ڈکشنری مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب معتمد اعزازی انجمن ترقی اُردو کا اختصار ہے۔ لیکن باوجود اختصار کے بہمہ وجہ مکمل اور جامع ہے۔ بڑی کتاب میں سے صرف وہ الفاظ جو قدیم اور متروک ہیں اور ادب میں مستعمل نہیں یا ایسی اصطلاحات جو کسی خاص فن سے مخصوص ہیں، اور عام طور پر ادب میں کام نہیں آتیں، خارج کر دی گئی ہیں بعض الفاظ کے معنی ہیں جو غیر ضروری مترادف تھے وہ بھی نکال دیئے گئے ہیں۔ اس سے لغت کی جامعیت اور خوبی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ایک اعتبار سے یہ لغت زیادہ صحیح اور مکمل ہے۔ کیونکہ بڑی کتاب کے بعد تیار ہوئی ہے اور اس میں جو کہیں کہیں خامیاں رہ گئیں تھیں وہ اس میں درست کر دی گئیں اور بعض الفاظ کے خاص معنی جو بعد میں معلوم ہوئے اضافہ کر دیئے گئے۔

کالجوں اور مدارس کے طالب علموں، عام پڑھنے والوں نیز مترجموں کے لیے یہ ڈکشنری بہت کارآمد ثابت ہوگی۔ کیونکہ اب تک کوئی انگریزی اُردو ڈکشنری اس جامعیت اور صحت کے ساتھ ہماری کسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔ ضخامت ۱۵۰۰ صفحات قیمت صرف ساڑھے بارہ روپے۔

ملنے کا پتہ

مینجر انجمن ترقی اُردو پاکستان، اُردو روڈ کراچی ۷

غزل



اور

مطالعہ غزل

اس کتاب کا موضوع غزل ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے غزل کے ارتقاء اس کی اہمیت اس کے جمالیاتی پہلو، جدید رجحانات اور اس کے مستقبل غرض اس کے ہر پہلو پر بہت تفصیلی اور بصیرت افروز بحث کی ہے اور غزل سے متعلق تمام مسائل کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے۔ چند مضامین غزل کے اصول کی تنقید میں ہیں اور چند غزل کے ارتقاء پر غزل پر ایسی جامع کتاب جس میں غزل پر اس تفصیل سے بحث کی گئی ہو۔ اب تک نہیں لکھی گئی۔

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو، اردو روڈ، کراچی ۷ پاکستان